جامعہ سلفیہ بنارس کا علمی، ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدث

بنارس

شمارہ ۱۰ • محرم الحرام ۱۴۰۶ھ • اکتوبر ۱۹۸۵ء • جلد: ۴

ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس

طابع: عبدالوحید

مطبع: سلفیہ پریس وارانسی

تزئین وکتابت: انور جمال

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

بدلِ اشتراک

سالانہ: ۲۵ روپیے

ششماہی: ۱۳ روپیے

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپیے

بیرون ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

پتہ

خط وکتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدلِ اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

MAKTABA SALAFIAH REORI TALAB VARANASI-221010

ٹیلی گرام: "دارالعلوم" وارانسی • ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

صدائے انقلاب

انور بستوی
ناظم اعلیٰ ریاستی جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی

کتاب اللہ و سنت کا ہمیں ہر چار کرنا ہے
مئے توحید سے پھر خلق کو سرشار کرنا ہے
گلستانِ وفا میں بو کے تخمِ ملتِ بیضا
بہجِ نو زمینِ کفر کو ہموار کرنا ہے
گھٹائیں کفر و بدعت کی جو ہر سو چھائی جاتی ہیں
جلا کر شمعِ دیں سارا جہاں ضوبار کرنا ہے
جہاں کو عدل اور انصاف کا درسِ حسیں دے کر
جفا و ظلم کے ایوان کو مسمار کرنا ہے
جو ہیں گم کردہ منزل وادیِ کفر و ضلالت میں
انھیں دینِ محمدؐ کا علمبردار کرنا ہے
حنین و بدر کے پھر معرکے دہرا کے عالم میں
مسلماں کو "اشداء علی الکفار" کرنا ہے
دماغوں میں سرایت کر چکی ہے جن کے چنگیزی
انھیں اسلام کی تلوار سے "فی النار" کرنا ہے،
جو کہتے ہیں کہ حق دائر ہوا ہے چار مذہب میں
اب اس تفریقِ ملت سے بدل انکار کرنا ہے
رسولِ پاکؐ کی سنت سے انورؔ جن کو نفرت ہے
عیاں ان پر مقامِ احمدِ مختار کرنا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شمارے کا موضوع ؟

ہندوستان کی علمی تاریخ میں حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک یگانۂ روزگار شخصیت گزرے ہیں۔ فنِ حدیث اور علومِ شریعت میں آپ کی عبقریت عجم سے عرب تک مسلم تھی اور ساری دنیا کے پروانے اس شمعِ علم و حکمت پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ آپ نے ایک مختصر سی مسجد میں بوریہ نشین رہ کر ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک اتباعِ سنت کا جو ولولہ پیدا کیا وہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہید، سید احمد شہید اور ان کے خلفاء کی طرف سے احیائے اسلام، اقامتِ جہاد اور تطہیرِ ہند کی جو تحریک برپا کی گئی۔ اس کے بھی آپ ایک انتہائی اہم ستون تھے۔ مگر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ حاسدین و مبغضین نے آپ کی شخصیت کو داغدار بنانے کے لیے عجیب عجیب اوچھے حربے استعمال کیے، اور اب بھی استعمال کر رہے ہیں۔ کہا گیا اور کہا جاتا ہے کہ آپ شاہ اسحاق کے شاگرد تھے، لہٰذا ولی اللہی مسند کے جانشین بھی وہ تھے، اور نہ شاہ ولی اللہ کا مسلک وہ تھا، جس کی آپ نے تبلیغ کی۔ یہ بھی کہا گیا اور کہا جاتا ہے کہ آپ انگریزوں کے وفادار تھے، تاکہ نگاہوں سے آپ کی منزلت گر کر آپ کے مسلکِ اتباعِ سنت کو زک پہنچائی جائے۔

جامعہ سلفیہ کا دستور ہے کہ عالمیت اور فضیلت سے فارغ ہونے والے طلبہ کسی موضوع پر مقالہ پیش کرنے کے بعد ہی سند حاصل کرتے ہیں۔ ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں فارغ ہونے والے ایک طالب علم مولوی محمد اقبال سلفی نے سندِ فضیلت کے لیے جو مقالہ پیش کیا تھا اس میں میاں صاحب پر لگائے گئے مذکورہ بالا دونوں الزامات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ موصوف کے ایک ساتھی مولوی محمد رفیق ـــ جو اس وقت فیجی میں ہیں ـــ اس کے اصل کارپرداز تھے۔

چوں کہ میاں صاحب کی وفات اب سے ۸۳ برس پہلے ۱۹۰۲ء میں ماہ اکتوبر ہی کی ۱۳ تاریخ کو ہوئی تھی، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ محدث کا موجودہ شمارہ اسی مقالے کی نذر کر دیا جائے۔ آپ بھی پڑھیے اور حقائق کے علم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تحقیق و تدقیق کا بھی اندازہ لگائیے۔

واللہ الموفق

●●●

حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ

شاہ اسحاق سے تلمذ

اقبال احمد السلفی

الحمد للہ الذی خلق الانسان وعلمہ البیان والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبی الانس والجان وعلیٰ آلہ وصحبہ الکرام ۔ امّا بعد

ابن عبد البر (متوفی ۴۶۳ھ) کا قول ہے ۔" یستدل علیٰ نباھۃ الرجل من الماضین بتباین الناس فیہ"[1] حافظ ابن عبد البر نے اس مختصر جملے میں تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ہر بڑے آدمی کے سلسلے میں اختلاف ہوئے ہیں اور یہ اختلافات کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے مختلف فیہ شخصیت کے مرتبہ کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ (م ۱۳۲۰ھ) ایک تاریخ ساز حیثیت کے مالک تھے قدرت نے انہیں جو مرجعیت اور مقبولیت بخشی تھی کسی کو کم ہی ملتی ہے ۔" ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء " آپ کی یہ شہرت اور ہر دل عزیزی بہتوں کے لئے موجب قلق بن گئی ۔ الزام ، بہتان ، تہمت تراشی کا ہر حربہ استعمال کیا جانے لگا اس طرح آپ کی شخصیت کو داغدار بنانے کی مکروہ کوشش کی گئی ، مجبوراً میاں صاحب کے نیازمندوں کو ان ریشہ دوانیوں کا پردہ

---

[1] الجواہر المضیئۃ فی طبقات الحنفیۃ ج ۲ ص ۲۹ طبع حیدرآباد

چاک کرنا پڑا اور ایک لامتناہی سلسلہ بحث کا دروازہ کھل گیا اس قسم کے تمام ایرادات پر اتنی بحث ہو چکی ہے کہ اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی ہے لیکن تعصب اور تنگ نظری کا برا ہو کہ آج بھی ایسے حضرات مل جاتے ہیں جو انہیں چبائے ہوئے نوالوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔

پروفیسر ایوب صاحب قادری کا شمار برصغیر کے بلند پایہ تذکرہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ تراجم کے سلسلے میں موصوف کی معلومات خاصی وسیع ہیں۔ مگر جماعتی اور گروہی عصبیت موصوف سے کچھ ایسی باتیں کہلواتی ہیں جو ان کے شایان شان نہیں۔

میاں سید نذیر حسین صاحب دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے قادری صاحب اپنے بعض نظریات پر تنی سے عمل کرتے ہیں اب تو یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ میاں صاحب کا جب بھی تذکرہ کریں تو شاہ اسحٰق (م ۱۲۶۲) سے عدم تلمذ اور انگریزوں سے وفاداری کا مسئلہ وغیرہ ضرور پیش کر دیں۔

شاہ اسحٰق سے میاں صاحب کا تلمذ نہ ماننے اور میاں صاحب کو انگریزوں کا وفادار ثابت کر دینے کی مصلحت یہ بتایا ہے کہ ہندوستان میں عدم تقلید کا رجحان ولی اللٰہی مکتبۂ فکر سے ماخوذ نہیں اور آزادی کی صبر آزما جدوجہد سے علماء اہلحدیث بالکل الگ تھلگ تھے اس طرح دیوبند ولی اللٰہی مکتبۂ فکر کا مسلمہ امین بن جاتا ہے اور شہیدین کی تحریک جہاد کا سارا کریڈٹ اس طبقہ کو مل جاتا ہے قادری صاحب جن کے ہمنوا ہیں۔

قادری صاحب شیخ الکل کا تذکرہ کس انداز سے کرتے ہیں ہم "تذکرۂ علماء ہند" اردو سے میاں صاحب کا ترجمہ نقل کرتے ہیں یہ پورا ترجمہ موصوف ہی کی کاوش کا ثمرہ ہے یہ لکھنے کے بعد کہ (فلاں فلاں اساتذہ سے تحصیل علم کی لکھتے ہیں آپ نے اجازت شاہ اسحاق سے حاصل کی) مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی قاری عبدالرحمٰن کا بیان لکھتے ہیں کہ جس روز شاہ اسحاق ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز نذیر حسین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اوّل اوّل ایک ایک حدیث پڑھی اور کل کتابوں کی اجازت حاصل کی شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ کر دے دیا اس واقعہ سے پہلے مدرسہ میں پڑھنے کبھی نہیں آئے ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی۔ ساڑھے تین مہینے تک رکھا اس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپئے اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفکٹ ملا جس زمانے میں (۶۵-۱۸۶۴ء)

ــــــــــــــــــــ

لے مقالہ اس وقت لکھا گیا تھا جب موصوف حیات تھے۔

وہابیوں پر مقدمے چل رہے تھے میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً ایک برس تک راول پنڈی کی جیل میں نظر بند رکھا گیا تھا مگر بقول مؤلف "الحیاۃ بعد المماۃ" وفادار گورنمنٹ ثابت ہوئے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا جب میاں نذیر حسین حج کو گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ر جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال کیا[1]

غور فرمائیے کہ اس سارے ترجمے میں قادری صاحب نے بکمال احتیاط صرف انہیں چند چیزوں کا انتخاب کیا ہے جس سے صاحب ترجمہ کی شخصیت مجروح ہو سکے اس پورے ترجمے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کے فضل و کمال اور برصغیر میں اشاعت حدیث کے سلسلے میں آپ کی جد وجہد پر دلالت کرے میاں صاحب کے ساتھ موصوف کا یہی رویہ دوسرے مقامات پر بھی ہے چنانچہ کالا پانی میں میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱) مولوی نذیر حسین بن جواد علی سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پہونچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۹ء میں دہلی پہونچے پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے مولوی عبدالحق دہلوی اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی، مولوی محمد بخش، مولوی عبدالقادر رام پوری (المتوفی ۱۲۶۵ھ/۱۸۵۴ء) (تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری) سے جملہ علوم حاصل کئے۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق دہلوی (ن ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۵-۶) سے حاصل کی[2]

نواب مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ "جس روز شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز نذیر حسین ان کی خدمت میں

---

[1] تذکرہ علماء ہند اردو مرتبہ ایوب قادری ص ۵۹۵ ۔ مقالات شروانی از حبیب الرحمن خاں شروانی ص ۲۸۲ ۔ الحیات بعد المماۃ ۔

[2] تواریخ حبیب یعنی کالا پانی مرتبہ محمد ایوب ایم اے ص ۲۶۲ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی ۔

حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اولیت کی ایک ایک حدیث پڑھی اور کل کتابوں کی اجازت حاصل کی شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ کر دیا یا اس سے پہلے مدرسہ میں پڑھنے کو کبھی نہیں آئے[1]

مولانا سلیمان ندوی نے اس سلسلے میں کچھ قلمی مواد کی نشاندھی کی ہے جو انہیں نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) کے کاغذات میں ملا تھا (حیات شبلی ص ۴۶) ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی ساڑھے تین مہینے گھر میں چھپائے رکھا جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپئے اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفکٹ ملا جیسں زماتے ہیں (۱۸۶۵ء) وہابیوں پر مہم ابتلا کے نتیجہ میں مقدمے چل رہے تھے تو میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً راولپنڈی جیل میں نظر بند رکھا گیا میاں نذیر حسین کے یہاں سے مختلف حضرات مولوی محمد جعفر تھانیسری (تین خط) مبارک علی ساکن پٹنہ (دو خط) عطاء اللہ (میرٹھ) محمد عثمان کانپور۔ امین الدین (کلکتہ) ابوسعید محمد حسین بٹالوی (امرتسر) محمد سوداگر (الموڑہ) کے خطوط برآمد ہوئے۔ خود میاں صاحب کے خطوط کی نقول ملیں جو مختلف حضرات کو لکھے گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں پانچ فرمان نکلے اس تمام مواد کی بڑے غور و فکر سے تحقیق کی گئی[2] نتیجہ یہ نکلا کہ میاں صاحب کا جہاد کی تحریک سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور بقول مؤلف الحیاۃ بعد المماۃ (سوانح عمری میاں نذیر حسین دہلوی) میاں نذیر حسین وفادار گورنمنٹ ٹھہرے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا جب میاں صاحب حج کو تشریف لے گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۱۴ / جون ۱۸۹۷ء کو شمس العلماء کا خطاب ملا[3]۔ میاں نذیر حسین دہلوی عامل بالحدیث عالم تھے ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں میاں صاحب کی شخصیت خاص امتیاز کی مالک رہی ہے ملک کے مختلف حصوں سے لوگ دہلی پہونچتے اور میاں صاحب سے تحصیل علم کرتے میاں صاحب کے قیام کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں آمین بالجہر، رفع یدین، آٹھ رکعت تراویح، فاتحہ خلف امام

۱؎ تواریخ عجیب یعنی کالا پانی مرتبہ محمد ایوب ایم اے ص ۲۶۲ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی۔

۲؎ بنگال گورنمنٹ ریکارڈس ۶۵ – ۷۱ -

۳؎ الحیات بعد الممات از فضل حسین مطبع اکبری آگرہ ص

اور حنفی عامل بالحدیث کے اختلافی مسائل کو خاص طور سے فروغ ہوا میاں صاحب نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب معیار الحق تصنیف کی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں میاں نذیر حسین کا انتقال ہوا[1]

اسی طرح اپنے ایک تازہ مضمون میں جو "معارف" لاہور میں شائع ہوا ہے قادری صاحب نے اپنی ہی تحقیقات نقل کر دیں ہیں تذکرہ علماء ہند میں شاہ اسحاق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الحیات بعد الممات (سوانح عمری میاں نذیر حسین) کے مؤلف کا یہ بیان درست نہیں کہ شاہ اسحٰق کی ہجرت کے بعد خاندان ولی اللہی کے صدر نشین میاں نذیر حسین ہوئے بلکہ حضرت شاہ اسحاق کے جانشین ان کے تلمیذ خاص شاہ عبد الغنی مجددی دہلوی تھے جنہوں نے اپنے شیخ کے مسلک کا اتباع کیا اور حجاز کو ہجرت کر گئے اور میاں نذیر حسین نے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے مسلک کے خلاف انگریزوں سے خوشنودی کا سرٹیفکٹ العام اور شمس العلماء کا خطاب حاصل کیا[2]

قادری صاحب کی ان تمام تحقیقات کو سامنے رکھ کر اگر غیر جانبداری سے غور کیا جائے تو یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری تگ و دو صرف اس لئے ہے کہ خاندان ولی اللہی سے میاں صاحب کا تعلق ختم کر دیا جائے اور اس مکتبۂ فکر کا صحیح جانشین دیوبند کو ثابت کر دیا جائے۔ مذکورہ بالا اقتباسات میں صراحت کے ساتھ قادری صاحب نے اس مقصد کو واضح کر دیا ہے۔

قادری صاحب کے بارے میں بھی جانتے ہیں کہ آپ دیوبند مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے زبردست حامی ہیں حتی کہ احناف اور اہلحدیثوں کے درمیان نزاعی مسائل میں آپ کی حیثیت ایک جانبدار فریق کی سی ہے افسوس کہ تاریخ نگاری میں بھی یہ پوزیشن صاف نظر آتی ہے اور آپ بالکل جانبدار بن جاتے ہیں مثال کے طور پر ہم ایک معاملے کو پیش کرتے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں وصایا اربعہ کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے اس میں آپ کی طرف سے ایک طویل معلوماتی مقدمہ بھی شامل ہے اس مقدمہ میں آپ نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی طرف بعض

---

[1] نوادر تاریخ عجیب یعنی کالا پانی ص ۲۶۴

[2] تذکرہ علمائے ہند مرتبہ ایوب قادری ص ۴۱۰

کتابوں کا انتساب غلط ہے اس سلسلے میں اپنا خاص ہدف اہلحدیثوں کو بنایا ہے اور خصوصیت کے ساتھ "البلاغ المبین" اور "تحفۃ الموحدین" کو جعلی اور وضعی قرار دیا ہے اس سلسلے میں آپ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں طرز تحریر شاہ صاحب کا نہیں[1] کسی سوانح نگار نے ذکر نہیں کیا[2]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور سے ابن تیمیہ کا پروپیگنڈہ مقصود ہے[3]۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا نام ولی اللہ دہلوی ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب فقیر ولی اللہ لکھتے ہیں[4]۔ یہ نہیں معلوم کی قلمی نسخہ کہاں سے ملا اور اس کی سند کیا ہے۔

یہ ہیں وہ دلائل جن کو بنیاد بنا کر موصوف نے ان دونوں رسالوں کو وضعی قرار دیا ہے ممکن ہے قادری صاحب کا خیال صحیح ہو یہ کوئی مستبعد بات نہیں مگر اسی مقدمے میں موصوف نواب سعادت یار خاں رنگین (م ۱۲۵۱) کے ایک منظوم وصیت نامے کو شاہ صاحب کا آخری وصیت نامہ قرار دیتے ہیں اور پوری قوت سے اپنے اس موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ تمام سوالات موجود ہیں ان میں سے کسی کا کوئی معقول جواب موجود نہیں خود لکھتے ہیں اصل (جسے منظوم کیا گیا ہے) دستیاب نہیں[5]۔ شاہ صاحب کے کسی سوانح نگار نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر پھر بھی ارشاد ہے کہ یہ شاہ صاحب کی تصنیف ہے اور "البلاغ المبین" ان کی طرف غلط منسوب ہوگئی ہے۔ "البلاغ المبین" کے سلسلے میں قادری صاحب کے اٹھائے ہوئے تمام ہی نکات کا جواب مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی دے چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ وہی فارسی کتاب ہے جو مطبع محمدی لاہور میں مولانا فقیر اللہ لاہوری کے اہتمام سے تقریباً پون صدی قبل شائع ہوئی تھی چند سال ہوئے مکتبہ سلفیہ لاہور نے تحقیق و تعلیق ضمیمہ اور عمدہ طباعت سے آراستہ شائع کیا تھا اب وہی نسخہ پشاور سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ بعض لوگ شاہ صاحب کی طرف اس کے انتساب میں خواہ مخواہ کا شک پیدا کرتے ہیں حالانکہ انکار کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں کتاب کا موضوع رسومات شرکیہ و بدعیہ

---

[1] مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ محمد ایوب قادری مطبوعہ سعید آرٹ پریس حیدرآباد ص ۲۸۔
[2] ایضاً ص ۲۹ [3] ایضاً ص ۲۸ [4] ایضاً ص ۲۸۔
[5] مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ محمد ایوب قادری مطبوعہ سعید آرٹ پریس حیدرآباد طباعت ۱۹۶۴ء ص ۳۲۔

کارد۔ وہی مضمون نامے جو شاہ صاحب کی تقریباً سبھی دعوتی قسم کی تصانیف میں موجود ہے جو اس میں تفصیلاً ہے اور غالباً یہی باعث ہوا کہ ماحول میں شدت کی بناء پر ابتدائیہ میں نام کی صراحت نہیں فرمائی گئی کہ حکمت اس کی متقاضی ہوئی جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تحفۂ اثنا عشریہ کے ابتدائیہ میں غلام حلیم ابن قطب الدین کا رویہ اختیار فرمایا شاہ صاحب کی تالیفات کے بیان میں "البلاغ المبین" کا ذکر بھی عموماً اسی وجہ سے نہیں ملتا علاوہ ازیں کسی کثیر التصانیف مصنف کی کسی کتاب کا ذکر رہ جانا کیا امکان سے بعید ہے حال ہی میں حافظ ابن القیم کی ایک اہم کتاب "احکام اہل الذمۃ" دو ضخیم جلدوں میں شام سے طبع ہو کر آئی ہے جس کا دنیا بھر میں ایک ہی مخطوطہ ڈاکٹر حمید اللہ مدظلہ کے خاندان سے دستیاب ہوا ہے اس کا تذکرہ حافظ ابن القیم کی کتاب میں نہیں ملتا پھر یہ انکار کیا اس سے ملتا جلتا رجحان نہیں کہ کسی ستم ظریف نے "تقویۃ الایمان" کے شاہ اسماعیل کی تصنیف ہی ہونے سے انکار کر دیا تھا امید ہے۔ "اتحاف النبیہ" کے مخطوطے کی لوح پر "البلاغ المبین" کے تذکرے سے بتوفیقہ تعالیٰ یہ خلجان رفع ہو سکے گا۔[1] "واللہ یہدی من یشآء الیٰ صراط مستقیم۔"

زنگین کے منظوم وصیت نامے کو شاہ صاحب کا آخری وصیت نامہ قرار دیتے ہوئے قادری صاحب نے جو دلائل فراہم کئے ہیں وہ یہ ہیں یہ خیالات و افکار شاہ صاحب کی دوسری تصانیف "حجۃ اللہ البالغۃ" وغیرہ میں موجود ہیں۔[2]

دوسرے یہ کہ زنگین نے اس کو شاہ صاحب کی طرف منسوب کیا ہے اگر یہ دلائل اس لائق ہیں کہ ان کی بناء پر اس وصیت نامے کو شاہ صاحب کا وصیت نامہ مان لیا جائے تو "البلاغ المبین" اور "تحفۃ الموحدین" تو اس سے بڑھ کر اس بات کی مستحق ہیں کہ انہیں شاہ صاحب ہی کی تصانیف میں شمار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مولانا فقیر اللہ عذر اسی کا قول نواب زنگین کے مقابلے میں

---

[1] حاشیہ اتحاف النبیہ للشاہ ولی اللہ محدث دہلوی مطبع اشرف پریس دہلی احمدی پریس ص ۶

[2] مجموعہ وصایا اربعہ ص ۳۲ ۔

زیادہ قابل اعتنار ہے رہ گئی مضمون کی یکسانیت تو وہ بالکل عیاں ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مزعومہ وصیت نامے میں ایسی بہتری چیزیں موجود ہیں جو قادری صاحب کے اس دعویٰ کو جھٹلا رہی ہیں کہ یہ مضامین شاہ صاحب کی دوسری کتابوں میں دستیاب ہیں ہم ذیل میں چند کی نشاندھی کر رہے ہیں ؎

دے اذاں بھی نہ قبر کے اوپر کوئی دینے لگے تو منع نہ کر[1]

قادری صاحب بالکل خاموش ہیں اور ضمیمہ میں مطلق اشارہ نہیں کرتے کہ یہ فکر شاہ صاحب کی کس کتاب میں موجود ہے۔ اس طرح قادری صاحب نے متعدد چیزوں کے بارے میں کہہ دیا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی چیز نظر سے نہیں گزری[2]۔

شرع میں ہے نکاح کا یہ اصول مرد و زن کر لیں ہم دگر کو قبول[3]

اس شعر سے ما بعد شاہد اور وکیل کا بیان ہے ولی کا مطلق تذکرہ نہیں حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ نکاح بلا ولی کے منعقد ہو جاتا ہے مگر شاہ صاحب اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ "حجۃ اللہ البالغۃ" میں "لا نکاح الا بولی" کے تحت فرماتے ہیں۔ واضح رہے کہ نکاح کے بارے میں تنہا عورتوں کو مختار بنانا ٹھیک نہیں کیونکہ ان کی عقلیں ناقص رہتی ہیں اس واسطے ضروری ہے کہ مردوں کا دخل ہو نیز نکاح میں ولی کی شرط مردوں کی عظمت کی دلیل ہے خود قادری صاحب نے بھی یہ عبارت نقل کی ہے مگر اس تضاد پر تنبہ نہ ہو سکا[4]۔

مہر کی انتہا ہے دس ہی درم مہر اس سے نہ باندھنا چاہئے کم[5]

حنیفہ کا یہی خیال ہے مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی ایسی حد متعین نہیں کی ہے جس میں کمی بیشی نہ ہو سکے چنانچہ آپ نے ایک شخص سے کہا کچھ تلاش کر لو خواہ لوہے کی

---

[1] مجموعہ وصایا اربعہ ص ۱۲۰۔ [2] مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ ایوب قادری ص ۱۳۴ و ص ۱۳۷۔
[3] مجموعہ وصایا اربعہ ص ۱۱۳ [4] ایضاً ص ۱۳۵—۱۳۶
[5] ایضاً ص ۱۱۴۔

انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔

صرف یہی چند چیزیں ہیں جو شاہ صاحب کے فکر سے متصادم ہیں کتاب میں اس سے اور بھی نمونے بآسانی مل سکتے ہیں ان تمام کے باوجود قادری صاحب کا اصرار ہے کہ اسے شاہ صاحب کا وصیت نامہ مان لیا جائے اس کی دو وجہیں ہیں (۱) اس مزعومہ وصیت نامے میں ایک شعر ہے۔

میرا مذہب ہے مذہب حنفی سب پہ روشن ہے یہ جلی و خفی[1]

(۲) اس وصیت نامے میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں لکھا گیا ہے۔ شعر ؎

اب مرے دل میں آسمائی ہے یہ دولت اکسٹھ برس میں پائی ہے یہ[2]

یہ دونوں باتیں قادری صاحب کے لئے بڑی پریشان ہیں کیونکہ اس سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب حنفی المسلک تھے اور دوسری طرف وہ مشہور وصیت نامہ منسوخ ہو جاتا ہے جس میں آپ نے فقہاء کی خدمت کرتے ہوئے فقہائے محدثین کے اچھے طریقے کو راجح قرار دیا ہے اور اپنی اولاد کو اسی پہ کاربند رہنے کی وصیت کی ہے یہ تمام باتیں صرف مسلک کی دفاع اور اس کی محبت سے معمور ہو کر کرتے ہیں اس لئے ہم نے ابتدا ہی میں عرض کر دیا ہے کہ موصوف اختلافی مسائل میں ایک جانبدار فریق ہیں۔

ذکر تھا میاں صاحب کا شاہ اسحاق سے تلمذ اور انگریزوں سے ان کی وفاداری کا مگر بات میں بات پیدا ہوتی گئی اور سلسلۂ کلام دراز ہو گیا اب ہم اصل بحث پر گفتگو کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الکل کا شاہ اسحاق سے تلمذ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے نہ صرف قادری صاحب بلکہ احمد رضا بجنوری جیسے دوسرے متعدد حضرات پیش کرتے رہتے ہیں۔

شاہ اسحاق اور میاں صاحب

یہ بات تو متفق علیہ ہے کہ میاں صاحب ۱۲۴۴ھ میں دہلی پہونچ گئے تھے، اسی طرح یہ حقیقت بھی ناقابل انکار

---

[1] مجموعہ وصایا اربعہ ص ۱۰۹ ۔ [2] ایضاً ص ۱۱۳

ہے کہ شوال ۱۲۵۸ھ تک شاہ اسحاق رحمۃ اللہ دہلی میں تھے۔ ظاہر ہے یہ طویل مدّت استفادہ کے لئے بہت کافی ہے اس مدت میں شاہ صاحب اور میاں صاحب کا ملنا جلنا بھی طے شدہ ہے چنانچہ منکرین اشارہ خیال کی روایت میں ہے کہ مہینہ دو مہینہ میں آیا کرتے تھے قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے[1] اس طرح میاں نذیر حسین کی شادی کے موقع پر شاہ صاحب کا طالب علموں کے ساتھ حاضر ہونا بھی مشہور بات ہے لیکن یہ کیسے طے ہو کہ اکتساب اور استفادہ بھی ہے یا نہیں اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) استاذ کی سند (۲) صاحب معاملہ کا اقرار (۳) معاصرین اور مورخین کی شہادت لیکن قبل اس کے کہ ہم اس معاملے پر ان تینوں طریقوں سے غور کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مسلک ولی اللّٰہی کا پابند ہونا شاہ اسحاق سے تلمذ پر ہرگز موقوف نہیں کیونکہ شاہ صاحب کے افکار کی امین ان کی کتابیں ہیں خاندان کے افراد سے حدیث پڑھے بغیر بھی آدمی ان کی کتابیں حاصل کرکے اس کا پابند ہو سکتا ہے دوسرے یہ کہ میاں صاحب کی عظمت اس پر ہرگز موقوف نہیں کہ شاہ صاحب سے آپ کا تلمذ ثابت ہو جائے بلکہ آپ کی عظمت کا راز ذاتی قابلیت اور اہلیت ہے، تلمذ بالکل اضافی چیز ہے آئیے اب اس مسئلے پر گفتگو کریں۔

استاد کی سند

مخالفین اور موافقین دونوں کا اتفاق ہے کہ شاہ اسحاق نے میاں صاحب کو سند عطا کی تھی مگر توعیت میں اختلاف ہے میاں صاحب کے پاس شاہ صاحب کے دست خاص سے لکھی ہوئی دستخط اور مہر سے مزین جو سند موجود تھی اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین - امابعد فیقول العبد الضعیف محمد اسحاق ان السید النجیب المولوی محمد نذیر حسین قد قرأ علی اطرافا من الصحاح السنۃ البخاری ومسلم وابی داود والجامع للترمذی والنسائی وابن ماجہ وشیئا من کنز العمال والجامع الصغیر وغیرھا وسمع منی الاحادیث الکثیرۃ فعلیہ

---

[1] کشف الحجاب بحوالہ ہدایۃ المرتاب ص ۳۸۔

ان یشتغل بقرأۃ ھذہ الکتب ویتدرس بھا لانہ اھلھا بالشروط المعتبرۃ عند اھل الحدیث وانی حصلت القرأۃ والسماعۃ والاجازۃ لھذہ الکتب من الشیخ الاجل الشیخ عبد العزیز المحدث الدھلوی وھو حصل القرأۃ والاجازۃ عن الشیخ ولی اللہ الدھلوی رحمۃ اللہ علیھما وباقی سندہ مکتوب عندہ حرر فی ثانی عشر من شھر شوال سنۃ ۱۲۵۸ من الھجرۃ والحمد للہ اولا واٰخرا۔ محمد اسحاق ۱۲۵۲ھ

یہ سند شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے دست خاص سے لکھی ہوئی ہے مولانا احمد علی سہارنپوری نے سند دیکھنے کے بعد اس کا اعتراف کیا تھا۔[۲]

مولانا محمد سعید صاحب بنارسی (م ۱۳۲۲ھ) کا بیان ہے کہ جامع صغیر کی الگ ایک دوسری سند بھی تھی اس میں لکھا ہوا تھا۔ قرأ علی کلھا (کشف الحجاب ص۳۵)

ظاہر ہے کہ ان دونوں سندوں کی موجودگی میں یہ افسانہ کہ "جس دن حجاز روانہ ہوئے اسی دن حاضر ہو کر اجازت حاصل کی" کٹھ حجتی اور دروغ گوئی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا "قرأ علی اطرافا" "سمع منی احادیث کثیرۃ" کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ بس چند کتابوں کی ایک ایک حدیث پڑھ لی ہے اور کہا "قرأ علی کلھا" کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے ایک ہی حدیث اس کتاب سے پڑھی ہے؟

گویا اگر ہم اس معاملے پر اس نقطۂ نظر سے غور کریں کہ شاہ اسحاق کا بیان کیا ہے تو معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور فیصلہ کی یہی آسان ترین صورت ہے اس کے بعد بھی اعتراف نہ کرنا تعصب اور تنگ نظری کی بدترین مثال ہے۔

میاں صاحب کا بیان

اس معاملے میں کسی قطعی رائے تک پہونچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ صاحب معاملہ کے بیان پر غور کر لیا جائے میاں صاحب کا بیان اس سلسلے میں بالکل واضح ہے فرماتے ہیں "در صحیح بخاری بوقت صحیح از جناب مولانا محمد اسحاق مرحوم

---

[۱] الحیات بعد المات ص۴۵ [۲] الحیات بعد المات ص۴۹۔

شریک شدم واکثر سامع بودم وکمتر قاری " یعنی صحیح بخاری کے درس میں صبح کو شاہ اسحاق کے یہاں حاضر ہوتا تھا۔ ان مجلسوں میں اکثر سامع رہتا تھا اور قاری کم۔ اسی طرح صحیح مسلم کے بارے میں فرماتے ہیں " در صحیح مسلم ہمی معاملہ رواداد " اسی طرح ہدایہ جامع صغیر اور دوسری کتابوں کے بارے میں میاں صاحب تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ کون سی کتاب کس وقت اور کس کے ساتھ پڑھی۔ رفقاء درس میں مولانا گل محمد پشاوری، مولانا عبداللہ سندھی، مولانا نور علی اور محمد فاضل صاحب کا تذکرہ خصوصیت سے کرتے ہیں یہ پوری داستان خود میاں صاحب کے قلم سے ہے اسے صاحب " الحیاۃ بعد الممات " نے پورا کا پورا نقل کر دیا ہے یہ یاد داشت (ص ۳۹ سے ۴۱) تک پھیلی ہوئی ہے اس کے علاوہ ایک اور یاد داشت میں لکھتے ہیں: " و احادیث بسیارے نیز از مولانا حاصل نمودم با وجود از دہ سیزدہ سال بصحبت مولانا فیض یاب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درمیں ازمنہ کثیرہ صدہا فتویٰ اتفاق تحریر او دادہ خود مولانا مرحوم بنا بر امتحان ونیز کارگذاری مستفتیاں سوالہا سپرد می فرمودند برائے تحریر جوابات۔ یعنی میں نے شاہ صاحب سے بہت سی حدیثیں بھی سنی ہیں اور بارہ تیرہ سال تک ان کی صحبت سے فیض یاب رہا۔ ...... اس طویل زمانہ میں سیکڑوں فتوے لکھنے کی نوبت آئی خود مولانا مرحوم امتحان کے طور پر اور کارگذاری جانچنے کے لئے بہت سے مستفتیوں کے فتاوے جواب لکھنے کے لئے عنایت کر دیا کرتے تھے۔ (الحیات بعد الممات ص ۳۹ تا ص ۴۱)

میاں صاحب کے یہ بیانات در حقیقت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے بیان " قرؤا علی اطرافا من الصحاح وسمع منی احادیث کثیرۃ " کی شرح و تفسیر ہیں دونوں بیانات بالکل یکساں ہیں ان بیانات کے علاوہ میاں صاحب نے اپنے ہزاروں شاگردوں کی سندوں پر لکھا ہے کہ

" انی حصلت القرأۃ والسماعۃ من الشیخ محمد اسحاق المحدث الدہلوی "

ان تمام چیزوں کو سامنے رکھنے کے بعد کسی منصف مزاج کے دل میں شک وشبہ نہیں رہ سکتا جو حضرات اس ثابت شدہ واقعہ کا انکار کرتے ہیں اس کا باعث تعصب کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ایک ذمہ دار صادق القول عالم دین برابر اس چیز کا اعلان کر رہا ہے کہ میں نے فلاں استاد سے فلاں کتاب اس وقت پڑھی میرے رفقاء درس یہ حضرات تھے اور اساتذہ کا قول بھی اس کی تائید

کر رہا ہے پھر بھی یہ حضرات آنکھ بند کر کے اس کا انکار کر رہے ہیں ان کا ضمیر بھی انہیں ملامت نہیں کرتا۔

دوسروں کی شہادتیں

اب ہم معاصرین کی شہادت کے اعتبار سے اس معاملے پر غور کریں گے یہاں ہمیں انکار و اقرار دونوں پہلو زیر بحث لانے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ پہلے منکرین کے بیانات پر بحث کریں پروفیسر قادری صاحب نے قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے جو روایت نقل کی ہے ہم نے انہی کے الفاظ میں ذکر کر دیا ہے انہی بیانات کو مولانا احمد رضا بجنوری نے اپنے حاشیوں کے ساتھ "انوار الباری ج دوم" میں نقل کیا ہے پھر مولانا عبدالغنی مجددی کے تذکرے میں اسی طرح کی ایک دوسری روایت بھی ذکر کی ہے یہ روایت ارواح ثلاثہ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے اس کے راوی امیر خاں نے مولانا عبدالقیوم بڑھانوی سے نقل کیا ہے کہ "جس روز شاہ صاحب حجاز جا رہے تھے میاں نذیر حسین حاضر ہوئے تو نواب قطب الدین صاحب (جن سے اس وقت میاں نذیر حسین سے دوستی تھی) کی سفارش پر حضرت نے ان سے تمام کتابوں سے ایک ایک حدیث پڑھائی اور اجازت دے دی"[1] اس روایت کو نقل کر کے صاحب انوار لکھتے ہیں۔ بظاہر یہ روایت ثقات سے مروی ہے" مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (م ۱۹۴۴ء) اس روایت پر بطور حاشیہ لکھتے ہیں "ایسی سند سند برکت ہے اجازت نہیں"[2]

یہی وہ دونوں روایتیں ہیں جن پر ان حضرات کا سارا دارومدار ہے اس لئے ہم تفصیل سے ان دونوں کی قدر و قیمت واضح کرنا چاہتے ہیں۔

قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور ان کی روایت

حقیقت یہ ہے کہ اس افسوسناک جواب اور جواب الجواب کے سلسلے کے بانی قاری صاحب ہی ہیں موصوف نے اس نظریہ کی تبلیغ کو اپنی ایک اہم ذمہ داری قرار دے رکھا تھا جگہ جگہ جا کر شد و مد کے ساتھ اعلان کرتے اور اس پر بحث و مباحثہ کے لئے لوگوں کو للکارتے تھے مولانا محمد سعید بنارسی (م ۱۳۲۲ھ) لکھتے ہیں کہ قاری صاحب ایک مرتبہ بنارس تشریف لائے اور اس نظریہ کی

---

[1] انوار الباری ج ۲۶ ص ۲۱۷ [2] ارواح ثلاثہ ص ۱۲۰

تبلیغ شروع کی تو افسوسناک صورت حال پیدا ہوگئی۔[1]

پانی پتی صاحب نے اپنی تصنیف کشف الحجاب میں اس مسئلے کا ذکر نہایت درشت انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں "کہ کبھی مسئلہ پوچھنے کو یا کوئی لفظ "جلالین" کا پوچھنے کو آجاتے تھے خدمت میں جناب مولانا اسحاق قدس سرہ کے بوقت ہجرت میاں صاحب ایک ایک حدیث پانچ کتابوں سے شاہ اسحاق کو سنا کر ایک پرچہ پر بطور سند کے لے لیا اور محدث بن بیٹھے"[2] اس مسئلہ سے موصوف کو کچھ ایسا شغف تھا کہ ملاقاتیوں تک سے اس کا تذکرہ کرتے رہتے چنانچہ مولانا شروانی سے ایک انتہائی سرسری ملاقات میں اس مسئلہ کا تذکرہ کیا تھا[3]۔ لیکن یہ سوال کہ موصوف نے یہ روش کیوں اپنائی اب بھی جواب طلب ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مختلف عوامل موجود ہیں۔

صاحب "الحیات بعد الممات" لکھتے ہیں "شاہ اسحاق صاحب نے ایک بار طلبہ سے پوچھا کہ "اذا" مفاجات کے لئے ہے طلبہ جواب دے ہی رہے تھے کہ قاری صاحب بول اٹھے کہ "اذا" مفاجات کے لئے آتا ہے؟ میاں صاحب نے مذاقاً کہا "یک نہ شد دو شد" قاری صاحب اس واقعہ سے ایسے برہم ہوئے کہ پھر بھلا نہ سکے"[4]۔

طالب علمی کا یہی واقعہ کیا کم تھا کہ موصوف کی نواب باندہ کے یہاں ملازمت کے زمانہ میں ایک اور واقعہ پیش آگیا۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ نواب صاحب کے یہاں قاری صاحب سے سینیر ایک دوسرے قاری موجود تھے انہیں لوگ قاری فیض کے نام سے جانتے تھے قاری فیض "کم علم" اور نابینا تھے لیکن ان کی تنخواہ پانی پتی صاحب سے زیادہ تھی قاری پانی پتی صاحب اس صورت حال پر سخت جھنجھلائے۔ اپنی اہمیت جتلانے کے لئے ایک کاغذ پر قرأت کے متعلق پچیس سوالات لکھ کر لائے اور نواب صاحب سے کہا کہ قاری فیض صاحب سے اس کا جواب دلا دیجئے۔ نواب صاحب نے یہ رقعہ قاری فیض کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد قاری فیض نواب صاحب کے ہمراہ بنارس آگئے اتفاق کی بات کہ انہی دنوں میاں صاحب

---

[1] ہدایۃ المرتاب بردما فی کشف الحجاب ص۳   [2] ہدایۃ المرتاب بحوالہ کشف الحجاب ص۳۷

[3] مقالات شروانی از حبیب الرحمٰن خاں شروانی   [4] الحیات بعد الممات ص۵۱۔

بھی بنارس تشریف لائے تھے قاری فیض صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میاں صاحب سے ان سوالات کا جواب لکھنے کی فرمائش کی جواب لکھ کر میاں صاحب نے پوچھا یہ سوالات کس نے دیئے ہیں یہ بتلانے پر کہ پانی پتی کے سوالات ہیں میاں صاحب نے فرمایا ہمارا پرانا یار ہے مگر بڑا غصہ ور، اس کو نہ معلوم ہو ورنہ بگڑ جائے گا لیکن قاری صاحب کو اس واقعہ کا علم ہو گیا تو سخت برہم ہوئے۔[۱]

یہ دونوں واقعات حقیقتاً انتہائی معمولی اور غیر اہم ہیں مگر قاری پانی پتی کی طبیعت سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے لئے یہ واقعات ہی بڑے اہم تھے صرف مذکورہ بالا واقعہ ہی پانی پتی صاحب کی حاسدانہ طبیعت کا بذات خود آئینہ دار ہے تاہم آئیے قاری صاحب کی مزاجی کیفیت سے متعلق چند مزید باتیں عرض کردوں یہ بات تو بہت مشہور ہے کہ قاری پانی پتی صاحب بڑے غصہ ور آدمی تھے مولانا سعید صاحب بنارسی لکھتے ہیں کہ قاری صاحب سخت غصہ ور آدمی تھے۔[۲] ڈپٹی امداد العلی اکبر آبادی نے بھی قاری صاحب کی حدت مزاجی کا ذکر کیا ہے صاحب "الحیات بعد الممات" لکھتے ہیں "قاری صاحب شدید الغیظ آدمی تھے"[۳] چند سطر قبل ہی میاں صاحب کا بھی ایک ریمارک گذر چکا ہے۔ مولانا احمد علی بجنوری ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میرے ایک استاد لکھوانے حضرت "پانی پتی" کے پاس گئے کلک موجود نہیں تھا فاونٹن پن دیدیا تو ہاتھ سے جھٹک دیا اور فرمایا کہ تم لوگوں میں نیچریت سرایت کر گئی ہے۔[۴]

درحقیقت پانی پتی صاحب کی یہ مزاجی کیفیت ایسی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی کہ جس کا ذکر الفاظ میں ناممکن ہے ایک واقعہ سے اس کا اندازہ لگائیے "آپ کے ایک شاگرد حنیف آروی کا بیان ہے کہ ایک بار قاری صاحب کچھ لکھ رہے تھے ایک رومال دھوپ میں خشک ہونے کے لئے پھیلائے ہوئے تھے رومال اتفاقاً اڑ گیا تو درست کر دیا پھر اڑا پھر ٹھیک کر دیا تیسری بار جب پھر ایسے ہی ہوا تو قاری صاحب سخت برہم ہوئے اور اٹھ کر رومال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس کے بعد جوتوں سے ان ٹکڑوں کی پٹائی شروع کر دی ساتھ ہی بلند آواز سے یہ بھی کہتے جاتے پھر اڑ، پھر اڑ۔[۵]

۱؎ الحیات بعد الممات ص۱۵۵　　۲؎ کشف الحجاب　　۳؎ الحیات بعد الممات ص۱۵۱

۴؎ انوار الباری ج ۲　　۵؎ ہدایۃ المرتاب ص۶ ۔

ظاہر بات ہے حدت مزاجی اور جوش غضب سے مغلوب طبیعت والا انسان ان مذکورہ بالا واقعات کا کیسے تحمل کرسکتا ہے میاں صاحب سے قاری صاحب کی عداوت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ میاں صاحب کے بڑھ کر ملنے کے باوجود قاری صاحب ان کی طرف ملتفت نہ ہوئے اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ اس پس منظر میں پانی پتی صاحب کے قول پر غور کرنا کیا کوئی معقول بات ہے۔

معاصرت ہی کیا کم تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ عداوت بھی جمع ہوگئی ایسی صورت میں اگر امام مالک جیسے جلیل القدر امام کا قول قابل اسناد نہیں قرار دیا جاسکتا تو یہ پانی پتی صاحب کس شمار و قطار میں ہیں۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں " ان مالکا عابه جماعة من اهل العلم فی زمانه باطلاق لسانه فی قوم معروفین بالصلاح والایانة والثقة والأمانة "[1] یعنی امام مالک پر کچھ اہل علم نے ان کے زمانے میں اس بات پر سخت نکیر کی ہے کہ انھوں نے بہت سے صالح ثقہ اور امین لوگوں پر جرحیں کی ہیں۔

روایت ارواح ثلاثہ

اب رہ گئی " ارواح ثلاثہ " کی روایت اس سلسلے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت بالکل خانہ زاد ہے ہمارے پاس اس کے جعلی اور وضعی ہونے کے متعدد شواہد موجود ہیں سر دست اجمالاً چند اشارے پر اکتفا کر رہے ہیں اس روایت کا ماحصل صرف اتنا ہے کہ " میاں صاحب کو شاہ صاحب سے تلمذ حاصل نہیں سند صرف اس کی دی گئی تھی کہ مجھ سے آج چند حدیثیں پڑھی ہیں، مگر ہم نے شاہ صاحب کے دست خاص کی لکھی ہوئی جو سند پیش کی ہے اس کے الفاظ بیانگ دھل اعلان کر رہے ہیں کہ یہ افسانہ بالکل فرضی ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ ہیں " سمع منی الاحادیث الکثیرة " اور " قرأ علی اطرافا من الصحاح " کیا یہ الفاظ یہی بتا رہے ہیں کہ واقعہ کی صورت وہی ہے جو یہ حضرات بتا رہے ہیں کیا ایک ہی مجلس میں تھوڑی دیر کے اندر احادیث کثیرہ کا سماع ممکن بھی ہے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے قول کے مقابل میں کسی کی بات ہرگز لائق اعتناء نہیں بن سکتی۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۳۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کے راوی امیر خاں صاحب دیوبندی حلقے میں خواہ کسی بھی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں مگر عام اہل علم کی نظر میں ایک قصہ گو سے زیادہ نہیں یہی وجہ ہے کہ "ارواح ثلاثہ" کی متعدد روایات کو اہل علم نے جعلی قرار دیا ہے مولانا غلام رسول مہر صاحب (م ۱۹۷۱ء) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: اس میں سید صاحب شاہ اسمٰعیل اور بعض دوسرے بزرگوں کے متعلق حکایات ہیں لیکن بعض حکایات بداہتاً غلط ہیں مثلاً حکایات ۵۴، ۵۵، ۵۸، ۹۱، ۱۱۰، ۱۲۱[1]

مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) نے بھی ایسی ہی رائے ظاہر کی ہے .... اس لئے ظاہر ہے ایسی اہم بحث میں داستان سرایوں کی شہادت ہرگز قابل قبول اور لائق اعتناء نہیں ہو سکتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں یہ بتلایا گیا ہے، کہ بغیر پڑھے سند نواب قطب الدین صاحب کی سفارش پر ملی تھی، مگر خود نواب صاحب اس کے برخلاف تلمذ کا بصراحت اعتراف کرتے ہیں۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں میاں صاحب کی وفات کے بعد ایک مضمون شائع ہوا تھا جو انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر کا تھا صاحب مضمون نے لکھا ہے، اس میں شک نہیں کہ آپ کو شاہ (اسحاق) صاحب کی خدمت میں تلمذ حاصل ہے چنانچہ مولانا قطب الدین نے اپنی کسی تصنیف میں اس کی تصریح کی ہے[2]، نواب قطب الدین صاحب کے اس اعتراف کے بعد اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس روایت کی آبرو ہی کیا رہ گئی۔

یہ ہے ان دونوں روایتوں کی حقیقت جن کی بنا پر دیوبندی مکتبۂ فکر کے تنگ نظر علماء میاں صاحب کی عالمانہ شان پر بٹہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اب ہم ذیل میں چند ایسے افراد کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے حق و انصاف کو ملحوظ رکھ کر حقائق کا اعتراف کیا ہے۔

مثبتین آنکھ بند کر کے حقائق کا انکار بڑے دل گردے کا کام ہے اس لئے اکثر انصاف پسند قادری اور قاری صاحب کی روش کو غلط قرار دیا ہے۔ ہم ذیل میں چند اہم حضرات کی

---

[1] سید احمد شہید ج ۱ ص ۲۴۲ [2] علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء۔

شہادتیں نقل کر رہے ہیں۔

مولانا محمد تھانوی (م ۱۲۹۶ھ)

مولانا موصوف دیوبندی مکتبہ فکر کے بلند پایہ عالم ہیں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "ہر روز الا نادرا، حاضر خدمت عالی حضرت استاذی مولانا ممدوح می شدند و حل مشکلات حدیث شریف و تفسیر و فقہ وغیرہ بخوبی می کردند . . . . وتوجہ خاطر حضرت مولانا محمد اسحاق قدس سرہ جانب مولوی نذیر حسین از بس بودہ است بوقت رونق افروزی حرمین شریفین بتقریب ہجرت مسموع است کہ برآں یقین است سند حوالہ مولوی سید نذیر حسین صاحب عطا فرمودہ اند و مجاز گردانیدہ فقط بجہت "ولا تکتموا الشھادۃ" ہرچہ معلوم مخلص بود بے کم و کاست وانمودہ . . . برقول اہل عناد گوش نباید نہاد سد راہ فیض است کہ از اوشاں جاری است بہ قدر کہ نو آموزاں برآں نازمی کنند زیادہ ازاں مولوی صاحب موصوف در ذخیرہ خویش نہادہ فراموش کردہ باشند" یعنی استاذ محترم کی خدمت میں اکثر و بیشتر برابر حاضر ہوتے تھے اور حدیث تفسیر و فقہ کی مشکلات کا حل طلب کرتے مولانا محمد اسحاق صاحب قدس سرہ کی توجہ مولوی نذیر حسین کی طرف بہت زیادہ تھی سنا ہے اور اس پر یقین بھی ہے کہ (مولانا اسحاق) جس وقت حرمین کی طرف ہجرت کرنے والے تھے آپ کو سند دی اور اپنا مجاز بنایا جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے "لا تکتموا الشھادۃ" فرمان خداوندی کی رعایت کرتے ہوئے بے کم و کاست بیان کر دیا اہل جہل و عناد کی بات نہیں سننی چاہئے کہ اس میں اس فیض کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے جو مولانا موصوف سے جاری ہے اتنی مقدار (علم و فضل) کہ جس پر نو آموزوں کو ناز ہوتا ہے مولانا موصوف نے حاصل کر کے فراموش کر دیا۔[1]

مولانا احمد علی سہارنپوری محشی بخاری

مولانا احمد علی سہارنپوری بھی ابتدا میں اس کا انکار کرتے تھے کہ میاں صاحب کو شاہ صاحب کی جناب میں تلمذ حاصل ہے چنانچہ اس بارے میں ان سے اور میاں صاحب سے کئی مرتبہ گفتگو ہوئی جب مولانا موصوف کو یقین ہو گیا کہ میاں صاحب کو تلمذ حاصل ہے تو علی الاعلان اس کا اقرار کر لیا فضل حسین مظفرپوری

---

[1] الحیات بعد الممات ص ۳۴

(۴) نے مولانا سہارنپوری اور میاں صاحب کے درمیان اس موضوع پر ہونے والی ایک گفتگو کی روداد یوں نقل کی ہے کہ میاں صاحب نے پوچھا کہ تم شاہ اسحاق کا خط پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا خوب پہچانتا ہوں میاں صاحب نے اپنی سند سامنے رکھ دی اور کہا کہ کہو یہ کس کا حرف ہے انہوں نے کہا کہ شاہ محمد اسحاق صاحب کا پھر پوچھا کہ مہر کس کی ہے مولوی احمد علی صاحب نے کہا کہ شاہ اسحاق صاحب کی[1]

غالباً انہی مناقشات کی وجہ سے مولانا سہارنپوری کی رائے بدل گئی اور انہوں نے متعدد طریقے سے میاں صاحب کے تلمذ کا اقرار کیا ایک اعلان عام میں لکھتے ہیں۔

"صحبت و زیارت و حاضر باشی مولوی صاحب ممدوح بحضرت مولانا نور اللہ مرقدہ چوں شمس نصف النہار ہویدہ است تخمیناً پانزدہ سال مولوی صاحب موصوف وحضرت مولانا در شہر دہلی بودند پس اشتباہ عدم صحبت و زیارت بے اصل است۔ واما اشتباہ اسناد کتب احادیث پس چوں اسناد و دستخطی حضرت مولانا ممدوح بدست مولوی صاحب موجود است محل اشتباہ نیز باقی نماندہ۔"

(محررہ پانزدہم ربیع الاول ۱۲۹۲ھ)[2] یعنی مولوی صاحب کی صحبت اور زیارت نیز ہر وقت مولانا نور اللہ مرقدہ کے پاس موجود رہنا یہ سب باتیں دوپہر کے سورج کی طرح واضح ہیں تخمیناً پندرہ سال تک مولوی (نذیر حسین) صاحب اور مولانا محمد اسحاق صاحب ایک ساتھ دہلی میں رہے ہیں اس لئے عدم صحبت و زیارت کا شبہ کرنا بے سود ہے رہا حدیث کی کتابوں کی سند کے بارے میں شبہ کرنا تو جب مولانا ممدوح کے دستخط کے ساتھ ایک سند مولوی صاحب کے پاس موجود ہے تو اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

یہ دونوں شہادتیں نیازمندوں کی نہیں مخالف مکتبہ فکر کے نمائندوں کی ہیں اس لئے میرے نزدیک ان کی شہادتوں کے بعد انکار کی گنجائش ہی نہیں باقی رہ جاتی پھر بھی ہم مزید چند بلند پایہ افراد کی شہادتیں نقل کر رہے ہیں۔

---

[1] الحیات بعد الممات ص ۴۹ [2] الحیات بعد الممات ص ۴۷۔

رحمان علی مؤلف "تذکرہ علمائے ہند" تذکرہ علمائے ہند میں مولوی شبلی جونپوری (م ۱۲۸۶ھ) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " واجازت کتب احادیث از مولوی سید نذیر حسین تلمیذ مولانا محمد اسحاق دہلوی یافتہ بحصول سند ممتاز گشت[۱]" ہم قادری صاحب سے (جنہوں نے اس کتاب کے ترجمہ و ترتیب میں بڑی محنت کی ہے) دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر میاں صاحب کی وہ کون سی حدیث کی سند تھی جس کی تحصیل باعث امتیاز ہوا کرتی تھی؟ ناظرین ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ رحمان علی صاحب (جنہوں نے میاں صاحب کا تذکرہ بھی اپنی کتاب میں کرنے سے اجتناب کیا ہے) کس قدر صراحت کے ساتھ شاہ اسحاق سے میاں صاحب کے تلمذ کی تصریح کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں بھی میاں صاحب کی شاگردی اور حصول سند و اجازت کا اعتراف ہے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (م ۱۳۰۷ھ) نواب صاحب اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں۔ "دریں سال (سنۃ الف و اثنین و تسع و اربعین) حدیث شریف از مولانا محمد اسحاق صاحب مرحوم و مغفور شروع فرمودند صحیح بخاری و صحیح مسلم بشراکت مولوی گل محمد کابلی و مولوی عبد اللہ سندھی و مولوی نور اللہ سروانی و حافظ محمد فاضل سورتی وغیرہم حرفاً حرفاً خواندند و ہدایہ و جامع صغیر بمعیت مولوی بہار الدین دکھنی و حید امجد قاضی محفوظ اللہ صاحب پانی پتی و نواب قطب الدین دہلوی و قاری اکرام اللہ وغیرہم و کنز العمال ملا علی متقی علاحدہ شروع فرمودند و دو سہ جزء بخواندند و سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و موطا امام مالک تمامہا بر مولانا ممدوح عرض نمودند و اجازہ از شیخ الآفاق حاصل نمودہ — یعنی ۱۲۴۹ھ میں مولانا محمد اسحاق مرحوم سے حدیث شروع کی صحیح بخاری اور صحیح مسلم مولوی گل محمد کابلی و مولوی عبد اللہ سندھی وغیرہ کے ساتھ حرفاً حرفاً پڑھی۔ ہدایہ اور جامع صغیر مولوی بہار الدین دکنی اور حید امجد قاضی محفوظ اللہ صاحب پانی پتی اور نواب قطب الدین دہلوی نیز قاری اکرام اللہ وغیرہ کے ساتھ پڑھی۔ کنز العمال الگ شروع کی

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی صاحب مطبع منشی نولکشور لکھنؤ ص ۱۹۳

اور دو تین اجزاء پڑھے سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، ابن ماجہ، موطا امام مالک بھی مولانا کے سامنے پڑھیں اور اجازت شیخ الآفاق (مولانا اسحاق صاحب محدث دہلوی) سے حاصل کی۔[1]

مولانا شمس الحق ڈیانوی (م ۱۳۲۹ھ)

مولانا ڈیانوی مرحوم غایت المقصود کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"واکتسب بعد ذلك العلوم الدينية من التفاسير والاحاديث عن الشيخ الأجل الاكمل محدث الدهر ابي سليمان محمد اسحاق الدهلوى متوفى سنة اثنتين وستين بعد الألف ومائتين ابن محمد افضل الفاروقى اللاهورى وسبط الشيخ العلامة عبد العزيز بن ولى الله الدهلوى فقرأ عليه الصحاح الستة بالضبط والاتقان والبحث والتدقيق وكنز العمال والجامع الصغير للحافظ السيوطى وصحب العلامة ثلاثة عشر سنة واستفاض منه فيوضا كثيرا واخذ عنه مالم يأخذ احد من تلامذته فبلغ مراتب الكمال وصار خليفة له . . . . وحصل له منه الاجازة فى شوال سنة ثمان وخمسين بعد الالف والمائتين"

یعنی اس کے بعد علوم دینیہ تفسیر اور حدیث کا اکتساب مولانا محمد اسحاق دہلوی سے کیا صحاح ستہ ضبط و اتقان کے ساتھ پڑھی۔ کنز العمال اور جامع صغیر للسیوطی بھی پڑھی۔ تیرہ ۱۳ سال آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ایسی چیزیں حاصل کیں جو دوسرے تلامذہ نہیں حاصل کر سکے اس طرح کمال کے درجہ تک پہونچ گئے اور آپ کے خلیفہ ہوئے ۱۲۵۸ھ میں آپ نے اجازت

له حیات شبلی ص۴۵، ص۴۶ ۔ میاں [illegible] حسین صاحب مظفر پوری : لکھتے ہیں :- پھر ابجد العلوم وغیرہ نواب تالیفات میں میاں صاحب کا ترجمہ یا تذکرہ نہ لکھنا کیا تعجب خیز نہیں ہے ؟ افسوس ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے ابن خلکان پر اعتراض کرتے وقت اس مثل کو پیش نظر نہیں رکھا یا پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر نکال تب دوسرے کی آنکھ کے تل کو دیکھ" (الحیاۃ بعد الـ[illegible]) یہ بر بنائے محض عدم اطلاع کی وجہ سے ہے۔

حاصل کی۔[1]

سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ھ)

سید صاحب نے اپنی متعدد تحریروں میں شاہ اسحاق سے میاں صاحب کے تلمذ کا اقرار کیا ہے حیات شبلی میں لکھتے ہیں۔ "شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد سید نذیر حسین صاحب بہاری دہلوی ہیں اس دوسرے سلسلے میں توحید خالص اور ردّ بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا۔"[2]

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں "مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مولانا شاہ اسحاق صاحب سے شاگردی کا مسئلہ بھی اہلحدیث و احناف میں مابہ النزاع بن گیا ہے احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازۃ حاصل ہے اور اہلحدیث ان کو حضرت شاہ اسحاق صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں مجھے نواب صدیق حسن صاحب کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا جس میں بتصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۹ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے (پھر نواب صاحب کی پوری عبارت نقل کرکے لکھتے ہیں) البتہ شاہ صاحب سے سند اجازت انہوں نے تحریری طور پر ۲ر شوال ۱۲۵۸ھ کو حاصل کی جب شاہ صاحب ہندوستان سے ہجرت کرکے حجاز جارہے تھے۔"[3]

مولانا محمد ادریس صاحب نگرامی (م ۱۳۳۰ھ)

مولانا نگرامی مرحوم نے تذکرۂ علمائے حال میں شاہ اسحاق صاحب سے میاں صاحب کے تلمذ کا اعتراف کیا ہے چنانچہ میاں صاحب کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ اسحاق صاحب کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "آپ کے شیوخ کے نام یہ ہیں۔ مولوی سید عبدالخالق

---

[1] غایۃ المقصود ص۱۱ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی۔ [2] حیات شبلی ۴۵ — ۴۶

[3] حیات شبلی طبع دوم ص۴۵ ص۴۶

مولوی شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین صاحب، مولوی شیخ کرامت العلی اسرائیلی، مولوی محمد بخش عرف تربیت خاں، مولوی عبدالقادر رامپوری، مولانا اسحاق دھلوی[1]

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (م ۱۹۳۵ء)

مولانا مرحوم "مقدمہ تحفۃ الاحوذی" میں شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تخرجت علیہ جماعۃ کبیرۃ منہم الشیخ الاجل مسند الوقت السید نذیر حسین الدھلوی والشیخ المحدث عبدالغنی بن ابی سعید المجددی الدھلوی والنواب قطب الدین مؤلف مظاھر الحق وغیرھم ثم انہ ھاجر الی مکۃ واستخلف من ھو فرد زمانہ وقطب اوانہ شیخنا الاجل السید محمد نذیر حسین الدھلوی فی اشاعۃ العلوم الحدیثیۃ"

یعنی شاہ اسحاق سے پڑھ کر علماء کی ایک بہت بڑی جماعت نکلی جن میں سید نذیر حسین دہلوی شیخ عبدالغنی مجددی، نواب قطب الدین وغیرہ شامل ہیں پھر شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی اور شیخ العرب والعجم سید نذیر حسین دھلوی کو علوم حدیث کی اشاعت کے سلسلے میں اپنا جانشین قرار دیا[2]

مولانا محمد حنیف بھوجیانی

مولانا محمد حنیف صاحب بھوجیانی اتحاف النبیہ کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ثم اقبل خاصۃ علی التفسیر والحدیث فقرأ تفسیر الجلالین والصحیحین حرفًا حرفًا علی العلامۃ الشاہ محمد اسحاق وذلک فی سنۃ ۱۲۴۹ھ شارکًا مع الغیر وقرأ علیہ بقیۃ الصحاح الست ومؤطأ الامام مالک بتامہا بالضبط والاتقان

---

[1] تذکرہ علمائے حال ص ۹۲۔ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔

[2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۵۲ طبع دوم مطبعۂ جدیدہ قاہرہ

والتدقيق واطرافا من الجامع الصغير للسيوطي وكنز العمال لعلي المتقي (ف ۹۷۵ھ) وفي اثناء هذا قرأ ايضا على الشاه محمد اسحاق في الفقه الهداية للمرغيناني والجامع الصغير للامام محمد رحمه الله وكان يفتي ويقضي بحضرة استاذه فيفرح ويرضى بفتياه بل كان الشيخ كثيرا ما يمتحنه في السوالات المشكلة والتلميذ يجيبه احسن جواب وهكذا اصحب شيخه ثلاثة عشر سنة واستفاض منه فيوضًا كثيرا واخذ عنه ما لم يأخذ احد من تلامذته فبلغ مراتب الكمال وحصل منه الاجازة في شوال سنة ثمان وخمسين بعد الالف ومائتين[1]

ابو یحیی امام خاں نوشہروی ابو یحیی امام خاں نوشہروی نے بھی اس کی اچھی وضاحت کی ہے۔ میاں صاحب کے حالات جو ص ۱۲۲ تا ص ۱۶۰ پھیلے ہوئے ہیں اس کو ملاحظہ فرمائیں۔ (تاریخ علماء حدیث ہند)

مولانا **عبدالحی حسنی لکھنوی (م ۱۳۴۱ھ)** "نزہۃ الخواطر" میں میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لازم دروس الشيخ محمد اسحاق بن محمد افضل العمري الدهلوي سبط الشيخ عبد العزيز بن ولي الله واجازه الشيخ المذكور سنة ثمان وخمسين ومائتين والف حين هجرته الى مكة المشرفة.. یعنی پھر آپ نے شاہ محمد اسحاق دہلوی کے درس میں پابندی سے حاضر ہونا شروع کیا اور شاہ صاحب موصوف نے آپ کو ۱۲۵۸ھ میں سند عطا فرمائی جبکہ آپ ہجرت کر کے مکہ تشریف لے جا رہے تھے[2]

مولانا عبید اللہ سندھی (م ۱۹۴۴ء) جماعت اہلحدیث کے ساتھ مولانا سندھی کی عنایتیں تعارف سے بے نیاز ہیں آپ یہ ماننے پر ہرگز تیار نہیں کہ میاں صاحب کو ولی اللہی مکتبۂ فکر کا امین تسلیم کرلیں لیکن اس مقصد کے لئے مولانا نے

---

[1] اتحاف النبیہ ص ۲۵ مرتبہ مولانا محمد حنیف بھوجیانی [2] نزہۃ الخواطر ج ص ۳۹۸

اس ثابت شدہ واقعہ کا انکار نہیں کیا بلکہ بصراحت کہا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد میاں صاحب کا رجحان شوکانی وغیرہ کی طرف ہوگیا اور تقلید (جو ولی اللہی مسلک کی بنیاد ہے) کا انکار کردیا اس لئے آپ شاہ صاحب کے مکتبۂ فکر سے الگ ہوگئے لیکن جہاں تک شاہ اسحاق سے تلمذ کا مسئلہ ہے اس کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

انتفع به خلق كثير الخ منهم ابنته الشيخة الصالحة خديجة المكية وابن خالته الشيخ عبد القيوم ابن عبد الحئ الدهلوی ومنهم السيد نذير حسين البهاری الدهلوی امام اهل الحديث والشيخ محمد بن عبد الرحمٰن السهارنپوری المكی [1]

بشیر احمد بن ڈپٹی نذیر احمد

ولی اور اصحاب ولی پر آپ کی کتاب واقعات دارالحکومت کافی مشہور اور مستند سمجھی جاتی ہے اور آج اسے ایک اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے مولوی بشیر احمد صاحب میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ نے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب علیہ الرحمۃ سے حدیث، وتفسیر پڑھی اور تیرہ برس تک آپ کی خدمت میں رہ کر آپ نے بہت سے فیوض وبرکات حاصل کئے غرض آپ ایسے مرتبۂ کمال کو پہونچ گئے کہ اپنے استاد علام کے سامنے فتوی دیتے اور فیصلے کرتے تھے اور حضرت استاد ان کو پسند کرتے اور خوش ہوتے تھے۔ شوال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق نے آپ کو علوم حدیث وغیرہ سے مستفید فرما کر مسند الوقت کردیا اور اسی سنہ میں جب آپ ہند کو خیرباد کہہ کر مہاجر بیت اللہ ہونے لگے تو افادہ اور افتاء اور وعظ وتذکیر اور درس وتدریس کے لئے آپ ہی کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر فرمایا۔" [2]

شیخ محمد اکرام

شیخ محمد اکرام صاحب نواب صاحب کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ "اس دور کے ایک دوسرے بزرگ جن کا فیض نواب صدیق حسن خاں سے

---

[1] حاشیۃ المسوی من احادیث الموطأ المطبعۃ السلفیۃ مکۃ المکرمۃ ص ۱۲

[2] واقعات دارالحکومت ص ۲۸ ج ۲ - از بشیر احمد طبع اولی ۱۹۱۹ء

بھی زیادہ پھیلا۔ سید نذیر حسین محدث تھے جو صوبہ بہار کے رہنے والے تھے لیکن پٹنہ میں مولانا سید احمد بریلوی کا وعظ سننے کے بعد دہلی کا رخ کیا (۱۲۴۳ھ) اور مسلک ولی اللہی کے کئی بزرگوں سے استفادہ کیا حدیث کی تکمیل آپ نے شاہ محمد اسحاق صاحب مہاجر مکی نبیرۂ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے کی۔ اور جب وہ مکہ ہجرت کر گئے تو آپ نے دہلی کی مسجد اورنگ آبادی میں حدیث اور تفسیر کا درس شروع کیا اور کوئی پچاس برس اس خدمت عظیمہ میں گذار دیئے۔ شمالی ہندوستان کے اکثر علمائے اہل حدیث کا سلسلہ استناد آپ تک پہونچتا ہے اور اس وجہ سے آپ کو شیخ الکل بھی کہتے ہیں[1]

خلیق احمد نظامی

خلیق احمد صاحب نظامی تاریخ کے مشہور عالم ہیں آپ مولانا ارشاد حسین صاحب رام پوری صاحب "انتصار الحق فی رد معیار الحق" کے پوتے ہیں اس لئے بھی اس مسئلے میں آپ کی رائے کافی اہمیت اختیار کر لیتی ہے میاں صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں"

"میاں نذیر حسین صاحب دہلوی حدیث کے مشہور عالم تھے حدیث و تفسیر شاہ محمد اسحاق سے پڑھی تھی ۱۳ر تیرہ برس تک ان کی خدمت میں رہ کر فیوض و برکات حاصل کئے تھے[2]

نسیم احمد امروہی

"الفرقان"، فروری و مارچ ۱۹۷۷ء کے مشترک شمارے میں مولانا نسیم احمد صاحب امروہی نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کا خاندان" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :۔ "ان کے باکمال تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ جن میں مفتی عبدالقیوم ابن مولانا عبدالحئی بڈھانوی، شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، صاحب "مظاہر حق"، نواب قطب الدین خاں دہلوی۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا عالم علی نگینوی ثم مراد آبادی اور مولانا نذیر حسین محدث وغیرہم بھی شامل ہیں[3]

یہ چند ایسے علمائے کرام کے اعترافات ہیں جن کو سیر و تراجم میں دست گاہ حاصل ہے ان میں دیوبند

---

[1] موج کوثر ص ۶۸ [2] تاریخی مقالات ص ۲۵۳ از پروفیسر خلیق نظامی

[3] الفرقان فروری و مارچ ۱۹۷۷ء۔

مکتبۂ فکر کے مستناد بھی ہیں اور ملک کے دوسرے بلند پایہ تذکرہ نویس بھی ان حضرات کی شہادتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ہی حضرات نے قاری اور قادری صاحب نیز احمد رضا بجنوری وغیرہم کی روش کو بالکل پسند نہیں کیا ہے۔

ظاہر ہے ان بزرگ علمائے کرام کے اعترافات کے سامنے قادری اور بجنوری صاحب کی بیش قیمت تحقیقات کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی، رہ گیا تعصب اور تنگ نظری کا مرض تو وہ لاعلاج ہے۔

آخر میں ہم یہ عرض کردیں کہ اپنے آپ کو مسلک ولی اللٰہی کا پابند اور حکمت ولی اللٰہی کا امین نیز ولی اللٰہی مکتبۂ فکر کا نمائندہ قرار دینے والا دیوبند حد درجہ تضاد کا شکار ہے ایک طرف تو یہ بلند بانگ دعوے ہیں لیکن دوسری طرف شاہ صاحب کی تغلیط، مخالفت اور ان کے مخصوص افکار سے جنگ کا ایک طویل سلسلہ بھی چھیڑ رکھا ہے ہم ذیل میں صرف چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

(۱) شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ عقائد میں اشعریت کے پابند تھے[۱] لیکن دیوبند ماتریدیت کا پیرو ہے۔ (۲) شاہ صاحب کی عمومی دعوت یہ تھی کہ تمام فقہاء کے اقوال کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر جانچا جائے جو موافق ہو اس پر عمل کیا جائے[۲] اور مخالف کو ترک کردیا جائے لیکن دیوبند نہ صرف تقلید جامد کا پابند ہے بلکہ اس کا زبردست داعی اور مستناد بھی ہے اور عملاً اس نے یہ طریقہ اپنا رکھا ہے کہ احادیث کو فقہاء حنفیہ کے اقوال کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول یا رد کیا جائے۔

ایک اور قدم آگے بڑھ کر دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ یہ حضرات شاہ صاحب کو کم علم ناقص المطالعہ متقدمین کی کتابوں سے بے خبر قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ انور شاہ کشمیری (متوفی ۱۹۳۱ء م کے داماد مشہور دیوبندی عالم احمد رضا بجنوری زاہد الکوثری (متوفی سنہ) کا یہ قول بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[۱] ملاحظہ ہو:۔ مقدمہ انوار الباری ج ۲ تذکرہ محدثین ص ۱۹۷

[۲] ملاحظہ ہو:۔ مجموعہ وصایا اربعہ ــــ مرتبہ ایوب قادری

علامہ کوثری نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شاہ ولی اللہ کا اصول و مذہب ائمہ مجتہدین کے بارے میں یہ فرمانا کہ وہ متاخرین کے ساختہ پرداختہ ہیں متقدمین سے منقول نہیں واقعہ کے خلاف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مطالعہ میں وہ کتب متقدمین نہیں ہیں جن میں اصول مذاہب کی نقل ائمہ مجتہدین سے منقول ہے"[1]

ایک اور مشہور دیوبندی عالم مولانا عبدالرشید نعمانی اپنی کتاب "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر خاصے درشت انداز میں نقد کیا ہے۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ "وکان ابوحنیفۃ رضی اللہ عنہ الزمھم بمذھب ابراھیم واقرانہ لا یجاوزہ الا ماشاء اللہ وکان عظیم الشان فی مذھبہ فانظر فی کتاب الموطأ تجدہ کما ذکرنا وکان عظیم الشان فی التخریج علی مذھبہ دقیق النظر فی وجوہ التخریجات مقبلا علی الفروع اتم اقبال وان شئت ان تعلم حقیقۃ ماقلنا فلخص اقوال ابراھیم واقرانہ من کتاب الآثار لمحمد رحمہ اللہ وجامع عبدالرزاق ومصنف ابی بکر بن ابی شیبۃ ثم قایسہ بمذھبہ تجدہ لا یفارقہ تلک المحجۃ الا فی مواضع یسیرۃ وھو فی تلک ایضا لا یخرج عما ذھب الیہ فقھاء الکوفۃ"[2] یعنی ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ابراہیم اور ان کے اصحاب کے مذہب کے سب سے زیادہ متبع تھے اس مذہب سے بہت کم تجاوز کرتے تھے ان کے طریقے کے مطابق تخریج میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وجوہ تخریجات میں انتہائی باریک بیں تھے فروعات پر تمام تر توجہ تھی اگر میرے اس قول کی حقیقت معلوم کرنی ہے تو امام محمد کی کتاب الآثار اور عبدالرزاق کی جامع نیز ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنف سے ابراہیم کے اقوال کی تلخیص کر لیجئے پھر اس کا موازنہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ امام صاحب اس

---

[1] ملاحظہ ہو انوار الباری حصہ دوم ص ۱۹۶ — ۱۹۷

[2] حجۃ اللہ البالغۃ ج اول ص ۱۴۶ "باب اسباب خلاف مذاہب الفقہاء"

طریقے سے بہت کم الگ ہوتے تھے اور ان تھوڑی سی چیزوں میں بھی فقہاء کوفہ کے طریقے سے الگ نہیں ہوتے۔

لیکن مولانا نعمانی کو شاہ صاحب کے اس قول سے سخت اختلاف ہے اگر بات صرف اختلاف تک محدود رہتی تو ہمیں اس سے کوئی تعرض نہ ہوتا لیکن معاملہ شاہ صاحب کے استخفاف تک پہونچ گیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "واما ما قال رحمہ اللہ وان شئت حقیقۃ ما قلناہ فلخص اقوال ابراھیم من کتاب الآثار لمحمد وجامع عبد الرزاق الخ فھذا دابہ فی تصانیفہ اذا اتی بدعوی یاتی بکلام یدھش الناظر"[1] یعنی شاہ صاحب کی عادت ہے کہ جب وہ کسی معاملے کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو دہشت پھیلا دینے والا انداز پیدا کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس نقطہ نظر کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فنحن بحمد اللہ قد طالعنا کتاب الآثار لمحمد ولخصنا اقوال ابراھیم النخعی رضی اللہ عنہ ثم قایسناہ بمذھب الامام فوجدنا الامام یجتھد کما یجتھد النخعی واقرانہ ونراہ فی کثیر من المواضع یترک رای ابراھیم ورآہ ظھریا" یعنی ہم نے کتاب الآثار امام محمد کا مطالعہ کر کے امام نخعی اور حضرت امام ابوحنیفہ کے اقوال کی تلخیص کی ہے اور ان کا باہم موازنہ بھی کیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ امام صاحب مختلف مقامات پر ابراہیم نخعی کی رائے کو ترک کر دیتے ہیں۔

مولانا نعمانی نے شاہ صاحب پر جس درشت انداز میں رد کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے کوئی انتہائی غلط بات کہہ دی ہے مگر حقیقت وہی ہے جو شاہ صاحب نے بیان فرمائی ہے چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف خود بخود زبان قلم پر آگیا اور فرمایا: "وان کان لا ینکر ان لآراء ابراھیم النخعی اثرا خاصًا فی تفقیہ الامام ابی حنیفۃ واجتھادہ"[2] مگر اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ابراہیم نخعی کی آراء کا امام ابوحنیفہ کے اجتہاد و تفقہ پر گہرا اثر پڑا۔

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص۱۲

[2] 〃 〃 〃 〃 〃

بات وہی ہوئی جو شاہ صاحب نے کہی تھی ان کے تقابل کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ عدد اور ہندسے کے اعتبار سے مسائل کا جائزہ لیا جائے بلکہ کہنا صرف یہ تھا کہ امام صاحب نے اپنے فقہ واجتہاد کے لئے انہی قواعد کو اپنا لیا جن کو ان سے پہلے ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب اپنا چکے تھے۔

ظاہر ہے ان تناقضات کے باوجود دعوی کرنا کہ مسلک ولی اللٰہی کا پابند صرف اور صرف دیوبند ہی ہے انتہائی حیرتناک اور مضحکہ خیز ہے۔

میاں صاحب ــــــ اور انگریزوں سے وفاداری کا مسئلہ

ایک جائزہ

میاں صاحب اور انگریزوں سے وفاداری اس مسئلے پر قادری صاحب نے جتنا اور جس مقصد کے تحت لکھا ہے گذر چکا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں قادری صاحب کی یہ تحقیقات صاحب "انوار الباری" نے حرف بحرف نقل کرلی ہیں[1] کیونکہ دونوں کا مقصد وہی ہے جس کا تذکرہ کرچکا ہوں۔

یہ کوئی نیا اور انوکھا الزام نہیں ہمیشہ مخصوص حلقوں سے اس کی تکرار ہوتی رہتی ہے قادری صاحب کا تو یہ دل پسند موضوع ہے، "تذکرہ علماء ہند" کے علاوہ "کالا پانی" میں بھی آپ نے اس موضوع پر خوب خوب داد تحقیق دی ہے۔[2] مئی ۱۹۷۶ء کے "المعارف" لاہور میں انہیں تحقیقات کو دہرادیا ہے میاں صاحب کی وفاداری کے متعلق قادری صاحب کے قطعی دلائل یہ ہیں۔ (۱) ۱۸۵۷ء میں ایک انگریز عورت کی

۱؎ مقدمہ انوار الباری ج دوم ص ۲۲۸، ص ۲۲۹

۲؎ مقدمہ تواریخ عجیب معروف بہ کالا پانی ص ۲۶۱ تا ۲۶۴

جان بچائی (۲) انگریزوں نے انہیں تیرہ سو روپئے بطور انعام دئے (۳) انگریزوں نے انہیں وفاداری کا سرٹیفکیٹ دیا۔ (۴) میاں صاحب نے ایک موقع پر اپنی خدمات کے عوض ڈپٹی ( ) کا عہدہ طلب کیا (۵) جہاد کے فتوی پر ان سے زبردستی دستخط حاصل کیا گیا۔

یہ ہے وہ فرد جرم جو قادری صاحب نے انتہائی جد وجہد کے بعد عائد کی ہے مقصد صرف یہ ہے کہ ان دلائل سے میاں صاحب کو انگریزوں کا وفادار یا کم از کم آزادی کی جد وجہد سے کنارہ کش ثابت کر دیں۔

کچھ تاریخ سے ناواقف ان دلائل پر ایک اور دلیل کا اضافہ کرتے ہیں کہ میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے فتوی جہاد پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا[1] مولانا نذیر احمد صاحب املوی (متوفی ۱۹۶۵ء) نے "اہلحدیث وسیاست" میں بعض شبہات کا محققانہ اور مسکت جواب دیا ہے مفتی انتظام اللہ شہابی (م ۱۹۷۳ء) نے بھی عمدہ بحث کی ہے میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ قادری صاحب کے فراہم کردہ ان تمام دلائل کا جائزہ لوں۔

میاں صاحب اور انگریز

یہ مغالطہ کہ میاں صاحب انگریزوں کے وفادار تھے غلط فہمیت کی پیداوار ہے اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس ماحول پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جس میں میاں صاحب کی تربیت ہوئی ہے۔

موصوف کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں ہوئی تھی وہاں انگریزوں سے وفاداری کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سترہ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز پٹنہ سے کیا یہاں[2] ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء میں مولانا محمد حسین (م ۱۲) خلیفہ سید احمد شہید کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا[3] پٹنہ ہی کے قیام کے زمانے میں سید احمد شہید (م ۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہید (م ۱۸۳۱ء) پٹنہ تشریف لائے اور اپنی پر تاثیر تقریروں سے توحید وسنت نیز جہاد کی روح پھونک دی میاں صاحب کا بیان ہے کہ آپ بھی ان مواعظ میں شریک ہوتے تھے[4] شہیدین سے بیعت وتعلق کے بعد خاندان صادقپور حرکت وعمل کی ایک مسلسل داستان بن

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ اہلحدیث وسیاست مؤلفہ مولانا نذیر احمد املوی
[2] الحیاۃ بعد المماۃ ص۱۵ [3] الحیاۃ بعد المماۃ ص۶

گیا اس نے جہاد و حریت کی قندیل کو جس عزم و ہمت کے ساتھ روشن رکھا یہ بس انہی کا کام تھا اسی ماحول میں میاں صاحب نے ابجد سے لے کر مشکوٰۃ تک کی تعلیم حاصل کی۔[1]

اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے دھلی کا قصد کیا اور بتاریخ ۱۳ رجب ۱۲۴۳ھ دھلی پہونچے[2] دھلی آنے کا قصد شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کرنا تھا مگر ۱۲۳۹ھ ہی میں شاہ صاحب کی وفات سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ دھلی پہونچے تو شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا حلقۂ درس جما ہوا تھا میاں صاحب کی تعلیم صرف مشکوٰۃ تک تھی اس لئے کچھ دنوں تک متعدد اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور ۱۳ سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحب کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اپنی لیاقت اور اپنی محنت سے شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر کیا اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے فتوی نویسی اور فصل مقدمات جیسی متعدد ذمہ داریاں شاہ صاحب نے بسا اوقات آپ کے سپرد کر دیں۔[3]

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ ہی کے زمانے سے ہندوستان کے مختلف مقامات پر ان کی تحریک کیلئے امداد کے مراکز قائم ہو گئے تھے ان مرکزوں میں دہلی کا مرکز کافی اہم تھا اس کی ذمہ داری شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے سر تھی، ظاہر ہے کہ استاذ سے اتنا قریب رہنے والا شخص اپنے آپ کو استاذ کی اتنی اہم مصروفیت سے الگ نہیں رکھ سکتا اس لئے اس سے تاثر بھی ایک فطری چیز ہے چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ سیاسی تحریک ص ۱۳۲

چنانچہ میاں صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز اسی وقت سے ہو جاتا ہے جبکہ شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ دھلی میں مقیم تھے۔ مولانا نصیر حسین منگلوری داماد شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد کے لئے سرحد سے برصغیر کے اکابر کے نام جو اعلام نامہ بھیجا تھا اس میں شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ساتھ شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا نام بھی موجود ہے[4] یہ اعلام نامہ تقریباً ۱۸۳۷ء میں جاری کیا گیا ہے اس وقت میاں

---

[1] الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۶ [2] الحیاۃ بعد المماۃ ص ۲۱ [3] مقدمہ غایۃ المقصود ص ۱۲

[4] ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین ص ۱۳۵ علماء حق کا شاندار ماضی ص

صاحب کی حیثیت صرف ایک طالب علم کی سی تھی ظاہر ہے کہ آپ کی گراں قدر خدمات ہی کے سلسلے میں اس کا مستحق سمجھا گیا کہ ان بلند پایہ اصحاب کے زمرہ میں آپ کو بھی شامل کر لیا جائے جن کے بارے میں مولانا مہر کا خیال ہے کہ "اس تاریک دور میں دعوت حق کے خیر مقدم میں پیش پیش تھے"[1]

۱۸۴۱ء میں شاہ صاحب نے حجاز ہجرت فرمائی آپ کے زمانے تک اس کی نگرانی خود آپ کے ہی ذمہ تھی لیکن ہجرت کرنے کے بعد مرکز کی نگرانی یقیناً دوسرے ہاتھوں میں چلی گئی مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دلی کے مرکز کو ایک بورڈ کی نگرانی میں دیدیا بورڈ کی صدارت مولانا مملوک علی (م ۱۸۵۱ء) کو سونپی گئی اور مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی مولانا عبدالغنی دہلوی (م ۱۲۹۶ھ) کو بورڈ کا ممبر نامزد کیا گیا[2]

اس طرح مولانا کے خیال میں میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اس بورڈ سے عملاً کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا مولانا سندھی کا یہ خیال ہے کہ دہلی کے علاوہ اب اس تحریک کا ایک اور مرکز "پٹنہ" بن گیا تھا میاں صاحب وغیرہ اسی مرکز سے وابستہ تھے، لکھتے ہیں "مولانا نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی مولانا ولایت علی رحمۃ اللہ علیہ کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے" ایک جگہ اور لکھتے ہیں "مولانا نذیر حسین دہلوی اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان (مولانا ولایت علی) کا ساتھ دیتے تھے"[3]

ظاہر ہے کہ میاں صاحب کا قیام دہلی میں تھا اور دہلی کا پرانا مرکز مولانا سندھی کی تحقیق کے مطابق پٹنوی گروہ سے الگ تھلگ تھا میاں صاحب کی اس گروہ سے وابستگی محض رسمی نہ تھی بلکہ آپ اس تحریک کے زبردست حامی تھے آگے چل کر ہم اس طرح کی متعدد شہادتیں فراہم کریں گے کہ میاں صاحب نے دہلی سے سرحد کے مجاہدین کا تعاون برابر جاری رکھا لیکن سردست ہم سندھی صاحب کے دہلوی گروپ اور اس کے بورڈ کی حیثیت واضح کر دیں گے۔

---

[1] سرگذشت مجاہدین ص ۱۲۷

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص

[3] " " " " " " "

بورڈ کی حیثیت

حقیقت یہ ہے کہ اس پورے گروہ کی سیاسی سرگرمیوں کا وجود خارج میں بالکل نظر نہیں آتا ان کا محافظ یا تو مولانا سندھی کا اختراع پسند دماغ تھا یا مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کا ایجاد پسند قلم ہمیں تو خارج میں جو شہادتیں ملتی ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بورڈ افسانے کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ اس بورڈ کے صدر مولانا مملوک علی (م ۱۸۵۱ء) نے اپنی ساری زندگی دہلی کالج سے وابستہ رہ کر گذار دی جو خالص انگریزوں کا قائم کردہ ادارہ تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی حکومت کے وظیفہ خوار سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ حکومت کے خلاف کسی بھی تحریک کی قیادت کرے مولانا مملوک علی کی صدارت کے مسئلے پر نہ صرف ہم کو بلکہ خود مولانا سندھی کے ماننے والوں کو سخت اعتراض ہے، پروفیسر ایوب صاحب فرماتے ہیں "ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل تو درکنار اشارہ بھی نہیں ملتا ان کی زندگی تو تمام تر درس و تدریس سے عبارت رہی ہے لہٰذا یہ صورت کچھ محل نظر سی معلوم ہوتی ہے"[1]

بورڈ کے دوسرے ممبر مولانا قطب الدین دہلوی ہیں استخلاص وطن اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے سلسلے میں آپ کا کیا نقطۂ نظر تھا اس کا اندازہ درج ذیل استفتاء اور اس کے جواب سے ہوگا یہ سوال ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر ایک ملک اسلام پر قبضہ نصاریٰ ہو جاوے اور وہ لوگ شعائر اسلام مثل نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، جمعہ و جماعت وغیرہ میں کسی طرح دست اندازی نہ کریں اور مثل سلطان اسلام کے ان سے تاب مقاومت بھی نہ رہے بلکہ مقابلہ میں خوف شان کسر اسلام ہو جیسا کہ اس وقت ہندوستان موجود ہے تو جہاد درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں مومنین مستامن نصاریٰ ہیں مستامن کو جس ملک میں استئمان سے رہ رہا ہے جہاد کرنا نہیں چاہئے کہ من جملہ شروط جہاد سے عدم عہد و امان من المسلمین والکفار، ہے اور نیز جہاد کے واسطے ظن غلبۂ مسلمین اور قوت و شوکت اہل اسلام

---

[1] مولانا احسن نانوتوی مرتبہ ایوب قادری (تذکرہ مملوک علی نانوتوی)

کی شرط ہے۔

دستخط محمد لطف اللہ، محمد قطب الدین دہلوی، خادم شریعت رسول اللہ قاضی و مفتی محمد سعد اللہ، محمد عالم علی[۱]

یہ فتویٰ واضح طور پر ان مجاہدین سرحد کے خلاف حاصل کیا گیا تھا جو سرحد پر جہاد کی شمع روشن کئے ہوئے تھے یہ وہی افراد تھے جو مولانا ولایت علی، اور عنایت علی وغیرہ کی سرکردگی میں کام کر رہے تھے ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ جنہوں نے سید صاحب سے مل کر علم جہاد بلند کیا تھا لیکن مولوی قطب الدین صاحب دہلوی ان تمام حضرات کے اس فعل کو بڑی صفائی کے ساتھ غیر شرعی بتلا رہے تھے اور مسلمانوں کو جہاد کے عمل سے دست بردار ہونے کا مشورہ دے رہے تھے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ ایسے شخص کو کیسے اپنے ہندوستانی مشن کی تکمیل کے لئے نامزد کر سکتے ہیں۔

بورڈ کے تیسرے ممبر مولانا عبد الغنی مجددی صاحب ہیں موصوف کے بارے میں قادری صاحب کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ آپ نے اپنے استاذ کے مسلک کی اتباع کرتے ہوئے ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز کی سکونت اختیار کر لی[۲]۔ گویا کہ بورڈ کے جتنے ارکین تھے ان تمام نے عملاً اس نظریہ اور مشن کو ترک کر دیا جو شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر تھا۔

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ میاں صاحب دہلی میں رہ کر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو پوری قوت سے جاری رکھے ہیں۔ مجاہدین سرحد کی امداد میں بھی پیش پیش ہیں اور جہاد کا علم بلند کرتے والے مجاہدین اور ان کے رہنماؤں سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب کے زمانہ میں بھی دہلی کا شمار مجاہدین

۱؎ تاریخ صحافت اردو ج دوم ص۳۱۱

۲؎ تذکرہ علماء ہند اردو ص مولانا یوسف بنوری لکھتے ہیں۔ تلمیذ الشیخ محمد اسحاق صاحبہ عبد الغنی المجددی المتوفی ۱۲۹۶ھ غیر انہ هاجر الی المدینۃ فلم یکن اسعادہ فی الهند طویلۃ (مقدمہ فیض الباری ص۱۷)

کے اہم امدادی مراکز میں ہوتا تھا۔

تحریک شہیدین کی امداد و اعانت کا کام سب جانتے ہیں کہ انتہائی رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا تلاش و جستجو کے بعد بھی آج تک وہ طریقہ کار کما حقہ روشنی میں نہ آسکا اس لئے ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس سلسلے میں میاں صاحب نے کیا کچھ کیا لیکن اتنی بات تو بالکل طے ہے کہ میاں صاحب مختلف ذرائع سے جہاد کی شمع کو روشن رکھنے کا انتظام کرتے رہے ہیں۔ اب ہم اجمال کے ساتھ میاں صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ کریں گے۔

میاں صاحب انگریزوں کی نظر میں

انگریزوں کی نظر میں میاں صاحب کی حیثیت انتہائی خطرناک تھی وہ آپ کو ہندوستانی وہابیوں کا مدار المہام اور قائد سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے اندر اس تحریک کے اعلیٰ قائدین سے کافی مستحکم روابط تھے ان میں خاندان صادق پور سے آپ کے تعلقات کافی اہمیت رکھتے ہیں وہابی سازش کیس ۱۸۶۴ء میں جب آپ کے مکان کی تلاشی لی گئی تو ان میں مولانا جعفر تھانیسری کے تین خطوط اور مبارک علی صادقپوری کے دو خطوط پکڑ لئے گئے[1]۔ اسی طرح سرحد کے قائدین سے بھی آپ کے عمدہ تعلقات تھے سرحد سے آنے والے قاصد برابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اسی طرح خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم رہتا تھا اسی تلاشی کے موقع پر امیر المجاہدین سید عبداللہ صاحب صادقپوری (م ۱۹۰۲ء) کے نام میاں صاحب کا ایک خط پکڑا گیا تھا جس سے ان روابط کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

میاں صاحب مختلف افراد کو اس بات پر آمادہ کیا کرتے تھے کہ وہ سرحد پر جاکر مجاہدین کی صف میں شامل ہو جائیں چنانچہ راج محل کے ایک گواہ کا بیان ہے کہ مولانا نذیر حسین صاحب نے اسے سرحد پر جانے کے لئے آمادہ کیا تھا۔[2]

اس کے علاوہ میاں صاحب کی کوشش یہ رہتی تھی کہ اپنے بعد ایک ایسی جماعت تیار کردیں۔ جو بزرگوں کے شروع کئے ہوئے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہونچائے اس کے لئے آپ نے مخصوص شاگردوں

---

[1] ضمیمہ کالا پانی از ایوب قادری۔ [2] ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۱۵

کو تیار کیا اور ان میں جہاد کی روح پھونک دی۔ ان میں مولانا محمد ابراہیم آروی (م ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (۱۳۳۶ھ) مولانا عبداللہ غازیپوری (۱۳۳۷ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخری دور میں سرحد پار کے مجاہدین کو افراد اور اسلحہ وغیرہ کی فراہمی وغیرہ کا سارا کاروبار انہی حضرات کے ذمے تھا[1] مہر صاحب لکھتے ہیں: "گویا آخری دور میں اعانت مجاہدین کا اکثر و بیشتر کام زیادہ تر اہل حدیث حضرات ہی نے انجام دیا۔"[2]

یہ تمام حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہیدین کی تحریک جہاد کے صف اول کے قائدین میں تھے مولانا سندھی کو اس حقیقت کا احساس ہے اور اپنے واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے تاریخ کا طالبعلم جانتا ہے کہ مولانا عنایت علی غازی (م ۱۸۵۸ء) کی زندگی سے یہ تحریک کھل کر انگریزوں سے ٹکرا رہی تھی[3] اس طرح دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی جماعت کی قیادت کر رہے تھے جو انگریزوں سے براہ راست ٹکرے رہی تھی اب اس پس منظر میں اگر ایوب صاحب قادری اور رضا صاحب بجنوری کے الزامات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یاروں کی صحبت میں پل کر جواں ہوئے ہیں۔

ان حضرات کے استدلال کا سارا دارومدار مؤلف "الحیاۃ بعد المماۃ" کے بیان پر ہے ہم اس بیان پر نقد و جرح کرنے سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک اور معاملے کو صاف کرلیں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم و جور کا سب سے بڑا ہدف اہلحدیث تھے اہلحدیثوں کو سنی برادران کی عنایت سے وھابی کا خطاب دے دیا گیا تھا اور اس کی خوب تشہیر بھی کی گئی تھی۔ وہابی اور باغی انگریزوں کی نظر میں مترادف الفاظ تھے[4] اس لئے انگریزوں کے ہر ظلم کا نشانہ سب سے پہلے یہی بنتے تھے۔ وہابی سازش کیس کے ہولناک مظالم اب بھی لوگوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں جس وقت "الحیاۃ بعد المماۃ" کی تالیف ہو رہی تھی اس وقت تک یہ اثرات تو بالکل تازہ تھے دل و دماغ کا ان سے متاثر ہونا بالکل فطری امر ہے چنانچہ میاں صاحب اور آپ کے کنبے نیز دوسرے اہلحدیثوں کو مظالم سے بچانا ہر اہلحدیث کا پسندیدہ کام تھا۔

---

[1] سرگذشت مجاہدین ص ۶۴۳ [2] سرگذشت مجاہدین ص ۶۲۱

[3] پہلی اسلامی تحریک، سرگذشت مجاہدین، اہلحدیث و سیاست وغیرہ۔ [4] سرگذشت مجاہدین ص ۴۲

اسی خیر خواہی کے جذبے میں بعض حضرات کا خیال ہوا کہ میاں صاحب اور ان کے خاندان کو گورنمنٹ کی نظر میں وفادار ظاہر کیا جائے تاکہ پھر ان روح فرسا واقعات کا اعادہ نہ ہو سکے آپ کے سوانح نگار فضل حسین مظفر پوری نے یہی کیا اور میاں صاحب کو وفادار ثابت کرنے کی زبردست کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کے غور و فکر کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کا نظریہ صحیح ہی ہو لیکن بہر حال اس کے اظہار پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی سوانح نگار بھی انسان ہوتا ہے اس کے اپنے نظریات رہتے ہیں ہم اس سے اس بات کا مطالبہ تو کر سکتے ہیں کہ وہ واقعات کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرے لیکن یہ مطالبہ ہرگز نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے نظریے کے مطابق کوئی نتیجہ نہ اخذ کرے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس نظریہ سے اختلاف کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے واقعات جس کی تائید کریں گے دنیا اسی نظریہ کو لیگی۔

یہ معاملہ تنہا فضل حسین اور میاں صاحب کا نہیں بلکہ تمام ہی حضرات اس زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۳۰ھ) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) یہ وہ بلند پایہ شخصیتیں ہیں جن کا شمار آج ارباب دیوبند صف اول کے مجاہدین آزادی میں کرتے ہیں لیکن مشہور دیوبندی عالم مولانا عاشق حسین میرٹھی نے جب "تذکرۃ الرشید" تالیف کی تو ان واقعات کا یکسر انکار کر دیا جسے آج ان حضرات کے کارنامے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے اور پوری قوت سے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ حضرات گورنمنٹ کے پکے وفادار ہیں۔ لکھتے ہیں "ہر چند کہ یہ حضرات بے گناہ تھے مگر دشمنوں کے یاوہ گوئی اُن کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا۔ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تا زیست خیر خواہ ثابت رہے"[1]

خصوصاً مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق لکھتے ہیں: "سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرمانبردار ہوں تو جھوٹے الزامات سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے جو چاہے کرے"[2]

اسی طرح ایک طویل باب میں ان واقعات پر بحث کرتے ہوئے ان کی تغلیط کی ہے اور سارے فساد کا ذمہ وار

---

[1] تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۷۹ [2] تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۵

قاضی عنایت کو قرار دیا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ ایک ذمہ دار دیوبندی عالم تھے میرا خیال ہے کہ کوئی بھی انہیں دروغ گو کہنے کی جرأت نہ کرسکے گا اس لئے موصوف کی ان تحقیقات کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہوجاتی ہے حالات اور قرائن بھی اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ حضرات اس طرح کی تمام سرگرمیوں کے ذمہ دار نہ تھے کیونکہ تھانہ بھون کا یہ ہنگامہ اس وقت شروع ہوا تھا جب دہلی دوبارہ انگریزوں کے قبضہ میں جاچکی تھی کیا یہ حضرات اتنے سادہ لوح تھے کہ اس وقت جبکہ سارا ہندوستان انگریز مخالف بنا ہوا تھا خاموش رہتے اور جب دوبارہ انگریزوں کا تسلط ہوجاتا ہے تو انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرتے اس طرح کی بات کوئی صحیح الدماغ شخص مشکل ہی سے کہے گا۔

دوسرے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تھانہ بھون کے ہنگامے کی اصل وجہ قاضی عنایت اللہ کے بھائی کا بے دردانہ قتل تھا اس قتل کا بدلہ لینے کے واسطے قاضی صاحب نے علم بغاوت بلند کیا اور انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا یہ سب کچھ کرنے کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب وغیرہ سے یہ درخواست کی کہ آپ لوگ ہمارے علاقے میں قضا کا عہدہ سنبھال لیں۔ ظاہر ہے کہ اس پورے ہنگامے میں ان نفوس قدسیہ کا اس کے علاوہ اور کوئی رول نہیں رہا ہے کہ انہوں نے قاضی صاحب کی یہ درخواست منظور کرلی۔

لیکن ہمارا مقصود یہاں اس مسئلے پر گفتگو کرنا نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ یہاں باوجودیکہ قرائن مولانا عاشق علی کے بیان کی تائید کررہے ہیں پھر بھی قادری صاحب اور سجنوری صاحب سمیت تمام دیوبندی حضرات میرٹھی صاحب کے اس بیان کو ہضم کرجاتے ہیں یا پھر وہی کچھ کہتے ہیں جو میاں صاحب نے فرمایا ہے لکھتے ہیں "تذکرۃ الرشید" کی تصنیف و ترتیب کا وقت وہ ہے جب برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استوا پر پہونچا ہوا تھا اور نہ صرف زبان و قلم بلکہ لوگوں کے ضمیر بھی اس کی عظمت و ہیبت سے متاثر تھے تو آپ کو بھی اپنی تحریریں وقت کے تقاضے کی تکمیل کرنی پڑی۔ انتہا یہ ہے کہ بعض چیزوں کے اعتراف و اقرار کے لئے بھی انکار کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات لکھتے وقت یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ۱۸۵۷ء اور اس کے نتائج و اثرات کا ذکر ہی نہ کریں اور شمس العلماء کی طرح دامن بچا کر نکل جائیں البتہ تقاضائے وقت یا اپنے طبعی میلان کے باعث آپ نے اپنے بزرگوں کو بچانے

کی کوشش زیادہ سے زیادہ کی ہے چنانچہ اس علاقے میں بغاوت کا اصل بانی اور علمبردار جناب قاضی عنایت علی رئیس تھانہ بھون کو قرار دیا ہے۔

غور فرمائیے کیا "الحیاۃ بعد المماۃ" کی تالیف کے وقت برطانوی سامراج کا نقطۂ عروج خط استوا پر نہیں پہونچا ہوا تھا یا "الحیاۃ بعد المماۃ" کے مصنف کے دل میں اپنے بزرگوں کے بچانے داعیہ موجزن نہیں تھا افسوس ہے کہ یہ حضرات جب اپنے مکتبۂ فکر سے باہر کے افراد پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسے وقتی بیانات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر بعض بلند پایہ اصحاب کی کردار کشی کا ایک حربہ بنا لیتے ہیں مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ فضل حسین صاحب کی رائے اس معاملہ میں بالکل کوئی وقعت نہیں رکھتی اس لئے اس کو پیش کرنا لاحاصل ہے ہم نے میاں صاحب کی سیاسی زندگی کی جو ایک ہلکی سی جھلک پیش کی ہے وہی اس مہمل دعوے کے بطلان کے لئے بالکل کافی ہے۔

وفاداری کی دلیل اور اس کا تجزیہ

مولانا فضل حسین مظفر پوری، پروفیسر ایوب قادری وغیرہ تمام حضرات وفاداری کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ میاں صاحب نے ایک غیر معمولی زخمی میم کی جان بچائی تھی اور ساڑھے تین مہینے تک اس کو بحفاظت رکھا پھر غدر کے خاتمے پر انگریزوں تک پہونچا دیا اور اس کے صلہ میں تیرہ سو روپئے بطور انعام حاصل کئے ہم چاہتے ہیں کہ اس دعوے کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کریں۔

سب سے پہلے سوال یہ ہے کہ آیا میاں صاحب نے کسی انگریز عورت کو پناہ دی تھی یا نہیں لیکن اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ یقیناً میاں صاحب نے ایک انگریز عورت کو پناہ دی تھی لیکن یہ عورت کیسے اور کن حالات میں پہونچی تھی البتہ غور طلب ہے۔ صاحب "الحیاۃ بعد المماۃ" کا بیان ہے کہ اس عورت کو میاں صاحب ایک ویران مقام سے اٹھا کر اپنے گھر لائے تھے[1] افتخار حسین صاحب کا کہنا ہے کہ اس میم کو ڈپٹی نذیر احمد صاحب اٹھوا کر لائے تھے[2] مولانا غلام رسول قلعوی کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ میرے والد اور مولانا عبداللہ صاحب غزنوی اس عورت کو میاں صاحب کے گھر لائے تھے[3]

---

[1] الحیات بعد المات ص ۷۷ [2] حیات النذیر ج ۲ ص ۴۸

[3] الاعتصام تحریک اہلحدیث نمبر

بشیر احمد صاحب مؤلف "واقعات دار الحکومت" لکھتے ہیں کہ میرے نانا نے بھی ایک میم مسز لیبنس کی جان بچائی ان کی عبارت یہ ہے: "میرے نانا عبد القادر متوسلان شاہی میں سے تھے وہ بھی گئے ان کے ساتھ دو پنجابی پٹھان بھی تھے انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت جس نے ہاتھ سے پانی پینے کا اشارہ کیا اپنے گھر لائے اور علاج کیا۔[1]"

یہ چاروں متضاد بیانات ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں مولانا نذیر احمد املوی (م ۱۹۶۵ء) نے ان میں جمع کی یہ صورت نکالی ہے کہ یہ سب لوگ ساتھ گئے تھے مگر مؤلف "حیاۃ النذیر" نے بتصریح لکھا ہے کہ میم کو گھر لانے کے بعد میاں صاحب کو مطلع کیا اسی طرح صاحب "حیاۃ النذیر" نے فضل حسین کے اس بیان کی جم کر تردید کی ہے لکھتے ہیں کہ "اس میں کچھ شک نہیں کہ مولوی نذیر حسین صاحب اور مولوی عبد القادر صاحب نے مسز لیبنس کی جان بچائی لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ مولوی نذیر صاحب مسز لیبنس کو کہیں سے اٹھوا کر لائے تھے اور اپنے گھر میں رکھا اصل واقعہ یہ ہے کہ ڈپٹی صاحب اور منیر اور شعیب مسز لیبنس کو اٹھا کر لائے۔ مولویوں نے صرف مذہبی تقاضے سے اس میم کی جان بچائی[2]" کچھ بھی ہو کم از کم تین روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ میاں صاحب میم کو خود نہیں لائے تھے اس لئے یہ بات تو تقریباً طے ہو جاتی ہے کہ مسز لیبنس کو لانے میں میاں صاحب کا ہرگز کوئی دخل نہ تھا۔

گویا اس سلسلے میں میاں صاحب کا کردار صرف یہ تھا کہ ایک زخموں سے چور مظلوم عورت آپ کے گھر تک لائی گئی خطرہ تھا کہ اگر بلوائیوں کو اس میم کے وجود کی ہوا لگ گئی تو نہ صرف اس کی جان بلکہ آپ کے سارے کنبے پر بھی قیامت آجائے گی اس لئے حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے اس بیچاری کو اپنی حفاظت میں رکھ لیا اور علاج و معالجہ کا معقول انتظام کیا۔ ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد اس کی قوم تک بحفاظت پہنچا دیا۔ صاحب "حیاۃ النذیر" لکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ بتقاضائے دینداری تھا ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ مولویوں نے صرف مذہبی تقاضے سے اس میم کی جان بچائی۔[3]

کیا اتنی سی بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میاں صاحب انگریزوں کے وفادار تھے واضح رہے

---

[1] واقعات دار الحکومت [2] حیاۃ النذیر ص ۴۸ ، ۴۹ [3] حیاۃ النذیر ص ۴۸ ، ۴۹

کہ اسلامی شریعت میں دشمن کی عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے اور جہاں تک مجروحین کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں کسی زخمی مقاتل کو بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے کیا مسٹر لیپنس کو اسلام کے اس فیاضانہ سلوک سے صرف اس وجہ سے محروم رکھا جاتا کہ وہ انگریز تھی اور اس کا تسلی تعلق ایک ایسی قوم سے تھا جو کل تک ہندوستان کی حکمراں طاقت تھی۔

بہرحال اس واقعہ سے میاں صاحب کی وفاداری پر استدلال کرنا کوئی معقول بات نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب کی کتاب "علماء حق کا شاندار ماضی" کا ایک پیراگراف نقل کردوں سرسید نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جن لوگوں کی مہر اس فتوے پر چھاپی گئی ہے ان میں سے بعضوں نے عیسائیوں کو پناہ دی ہے۔ مولانا میاں صاحبؒ اس پر تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں "دشمن اگر پناہ مانگیں تو پناہ دینا فتوی جہاد کے خلاف نہیں بلکہ جس کلام پاک کی روشنی میں جہاد کا فتوی دیا جاتا ہے اس کا حکم ہے" وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ[1] اگر برسر جنگ مشرکوں میں سے کوئی پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیدو تاکہ اس کو توفیق ہو کہ اللہ کی بات سنے اور اس پر عمل کرے (سورہ توبہ) بالخصوص عورت کا معاملہ تو اور بھی نازک ہے حدیث میں خصوصیت سے عورتوں، بوڑھوں، بچوں کے قتل کی ممانعت ہے[2]

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کا خیال ہے کہ اس واقعہ سے استدلال کرکے میاں صاحب کو وفادار ثابت کرنا سعی لاحاصل ہے مولانا نذیر احمد صاحب املوی نے اس واقعہ کا دلچسپ جائزہ لیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے بحث کرکے بالکل دو ٹوک کردیا ہے کہ اس واقعہ کا وفاداری سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ دہلی سے بے دخل کئے جا چکے تھے سارے ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں سے تقریباً نکل چکی تھی۔ جگہ جگہ ان کو قتل کیا جارہا تھا ان کی معاونت کے ادنیٰ سے شبہ پر بھی جان و مال سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا ایسے نازک اور مخدوش حالات میں وفاداری کے کیا معنی ہیں؟ کیا میاں صاحب اتنے سادہ لوح تھے کہ انگریزوں کی واپسی کی موہوم سی امید پر اپنی جان اور سارے خاندان کی عزت و ناموس کو داؤ

---

[1] القرآن الکریم سورہ التوبۃ ۔ [2] کتب حدیث

پر لگا دیتے ؟ ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

انعام کی حیثیت

واقعہ کی جو صورت ہم نے پیش کی ہے اس کی روشنی میں وفاداری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے لیکن کوئی اس فعل کو وفاداری یا اس طرح کے کسی دوسرے نام سے تعبیر کرے تو یہ اس کا اپنا فعل ہے میاں صاحب پر ہرگز اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی لیکن یہ سوال بہرحال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر وفاداری مقصود نہ تھی تو اس کام پر انعام اور سارٹیفکٹ کیوں قبول کی۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میاں صاحب نے اس عورت کو انسانیت اور شریعت کے اعلیٰ تقاضوں کے تحت پناہ دی تھی اس لئے آپ کا یہ فعل شرافت اور اعلیٰ کردار کا بہترین نمونہ تھا ناممکن تھا کہ اس رویہ سے مسز لیبنس متاثر نہ ہوتی اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ اس نے جاتے وقت کہا تھا کہ میں کوشش کروں گی کہ اس کا بدلہ دلواؤں [1]

اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ میاں صاحب کو چار سو روپئے اور ایک سارٹیفکٹ دیا گیا یہ چار سو روپئے ان نقصانات کی تلافی کے لئے دیئے گئے تھے جو میاں صاحب کے خاندان کو برداشت کرنے پڑے تھے لیکن آئیے یہ بھی جان لیں کہ وہ نقصانات کیا تھے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ستاون سے پہلے میاں صاحب کا قیام پنجابی کٹرہ میں تھا۔ صاحب الحیاۃ بعد المماۃ لکھتے ہیں کہ غدر کے بعد آپ کا محلہ صرف آپ کی وجہ سے محفوظ رہا [2] لیکن دوسری شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کا خاندان اور محلہ پوری طرح سے تباہی کا نشانہ بنایا گیا تھا پنجابی کٹرہ میں میاں صاحب کے پاس دو مکانات تھے ایک مکان تو وہی تھا جس میں آپ رہائش پذیر تھے اس کے علاوہ صاحب حیاۃ النذیر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ آپ کا ایک دوسرا نو تعمیر

---

[1] حیات النذیر ص ۴۸ از افتخار عالم بلگرامی، شمسی پریس دھلی۔

[2] الحیات بعد المماۃ ص ۱۵۲۔

مکان بھی تھا۔[1]

لیکن ستاون کے بعد پنجابی کٹڑہ کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا گیا اسی توڑ پھوڑ میں آپ کے یہ دونوں مکانات بھی منہدم کر دیئے گئے اور اسٹیشن اور ریلوے لائن میں شامل کر لیا گیا۔[2]

جن چار سو روپیہ کا تذکرہ مذکورہ بالا سطروں میں ہوا ہے اس کے علاوہ بھی سات سو کی ایک رقم ان منہدم شدہ مکانات کے معاوضہ کے طور پر دی گئی تھی چنانچہ اس کی رسید کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

Rs 700

یہی وہ کل رقم تھی جو میاں صاحب کو انگریزوں سے ملی تھی اس کی کل مقدار گیارہ سو روپیہ ہوتی ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ میاں صاحب کے ان کرم فرماؤں نے اس رقم کو تیرہ سو تک پہونچا دیا ہمیں تسلیم ہے کہ قادری صاحب نے جو ترجمہ نقل کیا ہے وہ "الحیاۃ بعد المماۃ" میں حرف بحرف موجود ہے لیکن ہمیں پروفیسر صاحب سے یہ حسن ظن ہے کہ آپ انگریزی کے اچھے عالم ہوں گے ایسی صورت میں ہم کو پروفیسر صاحب سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ موصوف ترجمہ کا مقابلہ اصل عبارت سے ضرور کر لئے ہوں گے خاص طور سے ایسی صورت میں یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ آپ نے اصل سرٹیفکٹ کے ترجمہ نقل کرنے کا دعویٰ کیا ہے اگر آپ چاہتے تو اس غلطی کا ازالہ کر سکتے تھے لیکن یہ غلط ترجمہ زیادہ مفید مطلب تھا اس لئے موصوف نے اصلاح کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

تاہم یہ سوال اب بھی بدستور باقی رہا جاتا ہے کہ میاں صاحب نے ان دونوں چیزوں کو کیسے قبول کر لیا؟

لیکن اس کا جواب واضح ہے ستاون[57] کی ناکامی کے نتیجے میں جب پوری سیاسی بساط الٹ گئی اور انگریزوں کے قدم اچھی طرح جم گئے تو انہوں نے وارد گیر کا ایک بھیانک سلسلہ شروع کر دیا معمولی شبہ کی بنا پر سخت سے سخت سزا معمولی بات تھی ان وحشتناک حالات نے ہر شخص کو سراسیما کر دیا تھا اس عدم

---

[1] حیات النذیر ص۴۸ [2] ۱۸۵۷ء از غلام رسول مہر ص۱۹۲ [3] الحیاۃ بعد المماۃ ص۸

تحفظ کی کیفیت میں ہر شخص اپنی بچت کے پہلو ڈھونڈنے لگا حتی کہ بہادر شاہ ظفر تک نے جان کی امان طلب کی ایسے ہولناک حالات میں اگر از خود حفاظت کا سامان مہیا ہو جائے تو کیا عقل و خرد کا فیصلہ یہی نہ ہوگا کہ اس سے مستفید ہوا جائے اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر میاں صاحب نے سرٹیفکٹ اور انعام نہیں بلکہ معاوضہ کو اس مصلحت کے تحت قبول کر لیا کہ انگریزوں کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکیں تو اس میں قباحت کیا ہے؟ خصوصیت سے ایسی صورت میں جب جہاد کے فتوی پر آپ کا دستخط بھی ثبت ہے اور آپ انگریزوں کی ایک مخالف قوت کے نہ صرف معاون و مددگار ہیں بلکہ اس کے قائدین کے درجے میں شامل ہیں۔

گویا دار و گیر کے سارے اسباب مہیا ہیں لیکن ایک بالکل اتفاقی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے نہ صرف آپ کا بچاؤ ممکن ہے بلکہ مستقبل میں شک و شبہ سے بالاتر ہو کر اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کا ایک زریں موقع بھی مل جاتا ہے ایسی صورت میں اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھانا نادانی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔؟

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ میاں صاحب کا معاملہ بہرحال جواز کی حدود میں تھا لیکن دوسرے بہت سے علماء نے اس سے بھی کم خطرات کے موقع پر حقائق سے بالکل انکار کر دیا مثال کے طور پر شیخ الہند ہی کے معاملے کو لے لیجئے موصوف کو جب ریشمی رومال سازش کیس میں گرفتار کیا گیا اور دار و گیر کا خدشہ لاحق ہوا تو موصوف نے بڑی صفائی کے ساتھ اس معاملے میں اپنی شرکت کا انکار کر دیا اس انکار کو آپ کے عقیدت مند آپ کی سیاسی بصیرت اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب "علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" میں اس واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ ہم ذیل میں "سفر نامہ اسیر مالٹا" سے ان سوالات اور جوابات کو بجنسہ نقل کرتے ہیں یہ سوالات اور جوابات بذات خود حضرت شیخ الہند کی تاریخ ہیں مزید برآں جوابات سے حضرت شیخ قدس اللہ سرہ کی ذہانت، ذکاوت، حاضر جوابی کے اندازہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی بخوبی علم ہو جائے گا کہ ایک انقلابی عالم کس طرح اپنے دشمن کو احمق بنا سکتا ہے[1]

---

[1] علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول ص۱۵۲ ۔

معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بڑے بڑے شیخ الطائفہ اس طرح کے اقدامات کی مدافعت پر اتر آتے ہیں اور ان کو سند جواز عطا فرماتے ہیں چنانچہ اس معاملہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا حسین احمد مدنی نے جوش عقیدت میں اس کا جواز بھی فراہم کر دیا ہے لکھتے ہیں، ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا جن کے دو معنی ہوں متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب دوسرے معنی لے۔ یہ جھوٹ نہیں ہے[1]

اگر کسی بے گناہ غیر مستحق کو کوئی ظالم قتل کرتا ہو اور جھوٹ بول کر اس کو بچانا ممکن ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا واجب ہوگا اور اگر جھوٹ کے ذریعہ کوئی بھلائی پیدا ہوتی ہو تو اس وقت جھوٹ بولنا مستحب ہو جاتا ہے[2]

ہمیں شیخ الہند کے اس رویہ پر بحث کرنی مقصود نہیں بتانا صرف یہ ہے کہ اس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا ایک عام بات ہے اسی لئے ہم شیخ الہند کے اس طرز عمل کو بھی زیادہ معیوب نہیں تصور کرتے البتہ ہمیں شیخ الہند کی ذات سے اس سے زیادہ جرأت مندانہ رویہ کی توقع تھی۔

۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد اور میاں صاحب کا دستخط

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں زیر بحث جہاد کے فتویٰ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ اس فتویٰ کا توڑ مہیا کرنے کے لئے انگریزوں نے ایک دوسرے فتویٰ کی تشہیر کرائی جس میں اس فتویٰ کے مندرجات کا رد کیا گیا تھا مولوی ذکاء اللہ صاحب نے زیر بحث فتویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ جاہل مسلمانوں کا جوش مذہبی زیادہ ہو گیا[3]

سرسید نے بھی اس فتویٰ کو ایک جنگی چال قرار دیا ہے موصوف کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے انگریزوں کو اس فتویٰ اور اس کے مفتیوں سے سخت کد تھی یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اس فتویٰ کو جعلی قرار دینے کی زبردست کوشش کی ہے۔

---

[1] نقوش حیات ج دوم ص ۲۰۲ [2] نقوش حیات ج دوم ص ۲۰۵

[3] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۶۷۵